خواجہ میر درد
ظہیر احمد صدّیقی

خواجہ میر درد

ظہیر احمد صدیقی

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

KHWAJA MEER DARD
BY
ZAHIR AHMAD SIDDIQUI

سنہ اشاعت : جولائی 1983 — شک 1905

پہلا اڈیشن : 3000

قیمت : 4=50

سلسلۂ مطبوعات ترقی اردو بیورو 304

اس کتاب کی طباعت کے لیے حکومتِ ہند نے رعایتی قیمت پر کاغذ فراہم کیا

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی 110066

طابع : جے-کے-آفسٹ دلّی 110006

پیش لفظ

کوئی بھی زبان یا معاشرہ اپنے ارتقا کی کس منزل میں ہے، اس کا اندازہ اس کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ کتابیں علم کا سرچشمہ ہیں، اور انسانی تہذیب کی ترقی کا کوئی تصور ان کے بغیر ممکن نہیں۔ کتابیں دراصل وہ صحیفے ہیں جن میں علوم کے مختلف شعبوں کے ارتقا کی داستان رقم ہے اور آئندہ کے امکانات کی بشارت بھی ہے۔ ترقی پذیر معاشروں اور زبانوں میں کتابوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ سماجی ترقی کے عمل میں کتابیں نہایت مؤثر کردار ادا کرسکتی ہیں۔ اُردو میں اس مقصد کے حصول کے لیے حکومتِ ہند کی جانب سے ترقی اُردو بیورو کا قیام عمل میں آیا جسے ملک کے عالموں، ماہروں اور فن کاروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔

ترقی اُردو بیورو معاشرہ کی موجودہ ضرورتوں کے پیشِ نظر اب تک اُردو کے کئی ادبی شاہکار، سائنسی علوم کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جغرافیہ، تاریخ، سماجیات، سیاسیات، تجارت، زراعت، لسانیات، قانون، طب اور علوم کے کئی دوسرے شعبوں سے متعلق کتابیں شایع کرچکا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شایع ہونے والی کتابوں کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شایع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ بیورو سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت نسبتاً کم رکھی جاتی ہے تاکہ اردو والے ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

زیرِ نظر کتاب بیورو کے اشاعتی پروگرام کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید کہ اُردو حلقوں میں اسے پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائرکٹر ترقی اُردو بیورو

فہرست

ایک بات 6
خواجہ میر درد کا زمانہ 7
حیات
خاندان 14
پیدائش اور تعلیم 16
ملازمت 17
سجّادہ نشینی 17
سیرت اور شخصیت 18
وفات اور مزار 27
تصانیف 28
شاگرد 29
تصوّف کیا ہے؟ 31
درد کی شاعرانہ خصوصیات 35
سادگی اور شیرینی 36
درد و غم 39
عشق و محبت 43
تصویر کشی 50
اخلاقی مضامین 52
زبان و بیان 61

ایک بات

اٹھارھویں صدی عیسوی میں جن لوگوں کو اردو شاعری کا ستون کہا جاتا تھا، ان میں خواجہ میر درد کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس عہد میں صوفیانہ شاعری کو جس نے اوڑھنا بچھونا بنایا وہ خواجہ میر درد تھے۔ انھوں نے سادے الفاظ میں جس طرح گہری باتوں کو ادا کیا وہ انھی کا حصّہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے صوفیانہ اشعار ضرور لکھے مگر ان کو فلسفہ سے بوجھل نہیں بنایا۔ انھوں نے وہی کہا جو انھوں نے دیکھا اور محسوس کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری دل سے نکلتی ہے اور دل پر جاکر اثر کرتی ہے۔ ایک خاص بات ان کی شاعری اور زندگی میں اور بھی ملے گی اور وہ یہ کہ دونوں ایک دوسرے کا عکس ہیں۔ سادگی، نفاست، سچّائی، ایمان کی پختگی ان کی زندگی کا جزو ہیں۔ اب اگر ان کی شاعری کی خصوصیات کو سامنے رکھیں تو یہی باتیں وہاں بھی ملیں گی۔

یہاں ایک دشواری کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ کہ خواجہ میر درد کا انداز کتنا ہی سہل اور سادہ ہو مگر انھوں نے شاعری کے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے، یعنی تصوّف وہ اس قدر سہل نہیں ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ تصوّف کے بارے میں اگر تفصیل سے نہ بتا سکیں تو کم از کم اس سے پیدا ہونے والے نتائج سے ضرور آگاہ کر دیں اور خاص طور پر اخلاق سے اس کا جو رشتہ ہے وہ واضح ہو جائے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب پسند کی جائے گی۔ اگر ہم اپنے بزرگوں کی مثال سامنے رکھیں تو آج بھی دنیا میں نیکیاں اور خوشیاں فراہم کی جا سکتی ہیں۔ بزرگوں کے کارنامے اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کی روشنی میں ہم اپنے مستقبل کا راستہ تلاش کر سکیں۔

ظہیر احمد صدیقی
شعبہ اردو۔ دہلی یونیورسٹی

خواجہ میر درد کا زمانہ

خواجہ میر درد کے نام سے ہر وہ شخص واقف ہوگا جو اردو شاعری کی تاریخ کے بارے میں تھوڑی سی بھی معلومات رکھتا ہے یا جس نے شاعری کا ذرا سا بھی مطالعہ کیا ہے۔ درد اور ان کے زمانے کے دوسرے شاعروں نے جس طرح شاعری کی اصلاح کی اور اس کو بے کار اور بے ہودہ خیالات سے پاک کیا۔ زبان کو درست اور خوبصورت بنایا اور اس کو، اعلیٰ خیالات سے مالا مال کر دیا۔ اسی کی بنا پر انھیں اردو شاعری کی عمارت کا ستون کہا گیا ہے اور ان کے زمانے کو اردو شاعری کا سنہرا دور بتایا گیا ہے کیونکہ اس زمانے میں شاعری نے جتنی ترقی کی کسی دوسرے زمانے میں اتنی تیزی سے ترقی نہیں کی۔ اس زمانے میں اردو شاعر کون کون تھے؟ ان کی شاعری کی کیا خصوصیات تھیں؟ ان کے بارے میں یہاں بتانا مقصود نہیں۔ یہاں ہم صرف درد کی شاعری اور ان کے حالات کے متعلق بتائیں گے۔

درد کا نام جو ان کے ماں باپ نے رکھا خواجہ میر تھا۔ جب انھوں نے شاعری شروع کی تو اپنا تخلّص درد رکھا۔ یہ تخلّص اتنا مشہور ہوا کہ یہی ان کا نام بن گیا۔ یہ تخلّص دیکھ کر ایک سوال دماغ میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر انھوں نے اپنے لیے اس طرح کا نام کیوں پسند کیا۔ کوئی اچھا سا ہنستا مسکراتا نام کیوں نہیں رکھ لیا۔ اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ بچپن کا نام جو ماں باپ کا رکھا ہوا ہوتا ہے اس میں بچّے کی عادت، طبیعت، مزاج کسی چیز کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا کیونکہ اس کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ آگے چل کر وہ کیسا نکلے گا۔ ماں باپ تو بس جس نام کو اچھا سمجھتے ہیں وہ بچّے کے لیے منتخب کر لیتے ہیں۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے۔ بہت سے لوگوں کے نام ان کے مزاج اور عادتوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ جیسے کمزور اور بزدل کا شبیر علی۔ کسی غریب کا نام امیر احمد اور بدصورت کا نام حسین بھی ہو سکتا ہے۔ مگر جب کوئی شخص اپنے لیے تخلّص اختیار کرتا ہے تو عام طور پر وہی رکھتا ہے جس سے اس کی عادت اور مزاج کا اندازہ ہو سکے غالب نے اپنا تخلّص اس لیے رکھا کہ ان کے دل میں سب سے بڑے ہونے کی خواہش

تھی۔ زندگی سے بیزاری اور موت کو پسند کرنے کے باعث شوکت علی خان فانی بن گئے۔

جوش کی طبیعت میں جوشیلا پن اور تیزی تھی۔ اس لیے اپنا تخلص جوش پسند کیا۔ اردو کے ایک شاعر بڑے رنگین طبیعت تھے۔ انھوں نے اسی مناسبت سے تخلص رنگین رکھا۔ لکھنؤ کے ایک شاعر جن کی طبیعت میں زنانہ انداز بہت تھا۔ وہ عورتوں کی زبان میں شعر کہتے تھے اور مشاعروں میں عورتوں کے کپڑے پہن کر جاتے تھے۔ ان کا تخلص نازنین تھا۔ اسی طرح درد نے اپنے لیے یہ تخلص اس لیے پسند کیا کہ ان کے زمانے اور ماحول میں چاروں طرف دکھ ہی دکھ تھا۔ (اس کا تفصیلی حال آگے کے صفحات میں لکھا جائے گا۔ ایسے میں ہنسی خوشی تو بڑی بات ہے کوئی سکون کا سانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ ہر شخص ان حالات سے متاثر تھا۔ درد جو عام لوگوں سے زیادہ حسّاس اور نرم دل تھے کس طرح اپنے کو الگ رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی پوری شاعری اس زمانے کے حالات کی کہانی بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے لیے تخلّص (درد) پسند کیا۔ جو ان کے جذبات اور خیالات کے لیے بالکل موزوں تھا۔

یہ تو سب ہی جانتے اور مانتے ہیں کہ آدمی کی طبیعت اور مزاج کو بنانے میں اس کے خاندان، ماحول اور زمانے کے حالات کو بہت دخل ہوتا ہے۔ آدمی کوئی عادت ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اچھا یا بُرا جو کچھ بنتا ہے بعد کو ہی بنتا ہے۔ خواجہ میر درد کے گھر اور خاندان کے بارے میں تو بعد کو بتائیں گے۔ پہلے ہندوستان اور خاص طور پر دہلی کے وہ حالات سنا دیں جس میں درد نے زندگی گذاری۔

ہم اس کہانی کا آغاز اس وقت سے کرتے ہیں جب ہندوستان کے تخت پر محمد ظہیر الدین بابر بیٹھا تھا۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت پر بیٹھا۔ ان دونوں بادشاہوں کا زیادہ زمانہ جنگ کرنے اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے میں گذرا۔ اس لیے یہ ملک کی ترقی کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ اس کے بعد اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب ایک کے بعد ایک تخت پر بیٹھتے رہے۔ ان سب کے زمانے میں حکومت مضبوط اور خوش حال ہوگئی۔ مغل حکومت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوگیا

انھوں نے اپنی عقل مندی اور انتظامی صلاحیت سے ہندوستان کی تمام ریاستوں کو مغل حکومت کے ماتحت اور وفادار بنا لیا۔ جہاں نرمی سے کام نہ نکلا تو طاقت کے زور سے انھیں اپنے ساتھ ملنے پر مجبور کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل حکومت کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ باہر کے کسی بادشاہ کو بھی ان سے مقابلہ کرنے اور ٹکر لینے کی ہمّت نہیں ہوسکتی تھی اور وہ طاقتیں بھی جو مغلوں سے پہلے یہاں کی ریاستوں پر حکومت کرتی تھیں انھوں نے بھی یہی بہتر خیال کیا کہ مغل حکومت کی اطاعت قبول کرلیں ہندوستان کی دولت جو پہلے حملہ آور دشمنوں کے قبضے میں چلی جاتی تھی اب ہندوستان کی خوشحالی پر خرچ ہونے لگی اور لوگ چین کی بنسی بجانے لگے۔

1707ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ اس کے مرتے ہی مغل حکومت کے لیے شاہزادوں میں جنگ ہونے لگی۔ ایک کو تخت سے اتارنے کے لیے دوسرا کسی امیر یا سردار کی مدد لیتا۔ بادشاہت مل جانے پر پہلے بادشاہ کے سارے ساتھیوں ہمدردوں اور عہدہ داروں کو ختم کرا دیا جاتا۔ ان کے خاندان کے لوگوں کو کولہو میں پسوا دیا جاتا۔ ان کو ایسی ایسی سزائیں دی جاتیں کہ ان کے خیال سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ بادشاہ ان امیروں اور سرداروں کا حکم ماننے سے انکار کرتا یا ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے کی کوشش بھی کرتا تو اس کا بھی وہی حشر بنا دیا جاتا جو اس سے پہلے بادشاہ کا ہوا تھا۔ بادشاہ تو صرف نام کا تھا۔ اصل حکومت یہ امیر اور سردار کرتے تھے۔ وہ کبھی بادشاہ کو ہٹانے کے لیے مرہٹوں سے مدد مانگتے اور کبھی مرہٹوں کی طاقت ختم کرنے کے لیے روہیلوں سے اور کبھی دوسرے ملک کے بادشاہوں کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دیتے۔ باہر کے حملہ آور ہندوستان کی دولت پر قبضہ کرنے کے شوق میں فوراً آ پہنچتے۔ چونکہ مشہور تھا کہ ہندوستان سونے کی چڑیا ہے لہٰذا وہ لوگ اس سونے کی چڑیا پر قبضہ کرنے کی کوشش کیوں نہ کرتے۔ یہ حملہ آور کچھ عرصہ لوٹ مار کرنے اور بے شمار آدمیوں کا خون بہانے کے بعد واپس لوٹ جاتے۔ کبھی نادر شاہ کے اور کبھی احمد شاہ کے حملوں سے دلی گونجنے لگتی۔ وہ طاقتیں جو مغل حکومت کے رعب اور طاقت سے ڈر کر خاموش ہوگئی تھیں۔ اب ایک ایک کر کے سر اٹھانے لگیں۔ اندرونی بغاوتوں اور بیرونی حملوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے باون سال کے مختصر

عرصے میں تیرہ بادشاہ تخت پر بیٹھے ۔ ان بادشاہوں میں بعض بادشاہ تو صرف دو تین ماہ بادشاہت کرنے کے بعد یا تو تخت سے اتار دیے گئے یا ان کو قتل کر دیا گیا۔ یہ بادشاہ کمزور ہونے کے علاوہ ذاتی لیاقت سے بھی محروم تھے ۔ امراء کے رحم وکرم پر زندگی گذارتے ۔ چونکہ ان کو یقین تھا کہ ان کی بادشاہت چند روزہ ہے تو وہ کوشش کرتے کہ جتنا بھی عیش کر سکتے ہیں کر لیں۔ دولت کے اعتبار سے تو ان کا دیوالیہ نکل ہی چکا تھا۔ اخلاقی حالت بھی بدتر تھی ۔ اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بادشاہ جو رعایا کا محافظ کہلاتا تھا اس زمانے میں رعایا کی خوش حالی اور ترقی کے بجائے اپنے عیش وعشرت کو ترجیح دیتا اور اس عیش پسندی میں ان کی جان کی بھی پرواہ نہ کی ۔ ذیل کے واقعہ سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دن جہاندار شاہ اور اس کی بیوی جو کسی بازاری خاندان سے تعلّق رکھتی تھی ، لال قلعہ کے جھروکے سے جمنا کا نظارہ کر رہے تھے ۔ اس کا نام لال کنور تھا لال کنور نے کہا کہ میں نے کسی کشتی کو کبھی دریا میں ڈوبتے نہیں دیکھا۔ بادشاہ نے اس کی خوشی کی خاطر حکم دیا کہ جمنا میں جو کشتی جا رہی ہے اس کو ڈبو دیا جائے ۔ ملازموں نے حکم کی تعمیل کی ۔ اب ڈوبتے ہوتے مردوں اور عورتوں اور بچّوں کی چیخ وپکار بلند ہو رہی تھی اور وہ دونوں اس کو دیکھ کر یوں خوش ہو رہے تھے ۔ گویا بڑا دلچسپ ڈرامہ ہے ۔

محمد شاہ کے زمانے کا وہ قصہّ بھی سنا ہوگا کہ نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو دہلی میں قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوگیا۔ نادر شاہ قلعہ سے باہر آکر مسجد روشن الدولہ (چاندنی چوک) میں بیٹھ گیا اور حکم دیا کہ جو نظر آئے اس کی گردن مار دو۔ کہا جاتا ہے کہ سات آٹھ ہزار آدمیوں کا خون اس کی گردن پر رہا۔ دہلی شہر اس طرح اجڑ گیا جیسے یہ کبھی آباد ہی نہ تھا۔

ان بادشاہوں میں سب ایک سے بڑھ کر ایک ناکارہ، نااہل اور خود غرض ، عیّاش اور فضول خرچ تھے ۔ ملک کی آمدنی جو ریاستوں کے آزاد ہو جانے اور ملک کے ٹکڑوں میں بٹ جانے سے پہلے ہی کم ہوگئی تھی جو باقی بچی وہ بادشاہ اور امیروں کی عیّاشیوں اور فضول خرچیوں کی نذر ہوگئی ۔ یہ لوگ اس ڈر سے کہ دولت اور طاقت

ہاتھ سے کب نکل جائے جی بھر کے عیش کرتے اور فضول کاموں میں پیسے کو برباد کرتے۔ یہ حال تو امراء کے طبقے کا تھا اب عوام کی حالت یہ تھی کہ وہ بھوکے مرتے۔ فوج کی تنخواہیں کئی کئی ماہ نہ ملتیں۔ وہ اپنے ہتھیار اور سامان بیچ بیچ کر اپنا پیٹ بھرتے۔ ضروریات کی چیزیں میسّر نہیں تھیں۔ جان کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا۔ غرض ہندوستان اس زمانے میں بد امنی بے چینی، غریبی اور بدحالی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ان حالات کی جھلک ان شاعروں کے اشعار اور مقولوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جو اس زمانے میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ میر تقی اپنی کتاب "ذکر میر" میں لکھتے ہیں۔

"دہلی کی حالت بیواؤں سے زیادہ دکھیاری ہے۔ جس کا نہ کوئی سر دھرا ہے اور نہ والی وارث"

اسی بات کو اپنے اشعار میں بھی دہرایا ہے ۔

اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ اک اک قدم پہ یاں گھر تھا

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج وتخت کا

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سودا نے اس تباہی وبربادی کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے ۔

باغ دلّی میں جو ہوا اک روز میرا گذر
نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار

نخل[1] بے بار[2] کھڑے، سوکھی پڑی ہیں روشیں
خاک اڑتی ہے ہر اک طرف پڑے ہیں خس وخار[3]

گھوڑا لے گر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا[4] پہ نشاں ہے

گذرے ہیں سدا یوں علف[5] ودانہ کی خاطر
شمشیر[6] جو گھر میں تو سپر[7] بنئے کے یہاں ہے

شاہ حاتم جو اسی عہد کے ایک مشہور شاعر ہیں اور سودا کے استاد ہیں۔ انھوں نے دل کا نقشہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

امیر زادے ہیں حیران اپنے حال کے بیچ
تھے آفتاب پر اب آ گئے زوال کے بیچ

پھرے ہیں چرخ سے ہر دن تلاش مال کے بیچ
وہی گھمنڈ امارت[8] ہے پر خیال کے بیچ

خدا جو چاہے تو پھر ہو، پر اب تو ہے دشوار

---

[1] نخل = درخت [2] بے بار = جس میں پھل نہ ہو [3] خس وخار = تنکے اور کانٹے

(۴) عالم بالا۔ دوسری دنیا (۵) علف۔ چارہ۔ دانہ [6] شمشیر تلوار [7] سپر۔ ڈھال [8] امارت۔

یہاں کے قاضی و مفتی ہو تمہیں رشوت خور — یہاں کے دیکھ لو سب اہل کار ہیں گے چور
یہاں کرم سے نہیں دیکھتے کسی اور — یہاں دلوں سے بھلائی ہے سب نے تو اور گور[1]

یہاں نہیں ہے مدار بغیر دار و مدار

غرض یہ کہ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ان حالات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ بادشاہ فقیر، امیر، غریب، عالم، جاہل، شاعر، ادیب، پیشہ ور اور فنکار ہر شخص حالات کا شکار تھا۔ کسی کی جان اور عزت محفوظ نہ تھی۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ دہلی چھوڑ چھوڑ کر جہاں چھپنے کا ٹھکانہ دکھائی دیا وہاں پہنچ گئے۔ اپنا گھر بار اور عزیز دوستوں کو چھوڑنا کوئی آسان کام نہ تھا اور اس زمانے میں جب کہ سفر کی وہ سہولتیں بھی نہیں تھیں جو کہ آج کل ہیں۔ لوگ بیل گاڑیوں سے یا زیادہ سے زیادہ گھوڑا گاڑیوں پر سفر کرتے تھے۔ راستے میں لٹیروں اور ٹھگوں کا ہر وقت ڈر رہتا تھا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے لیے ہفتے بلکہ مہینے درکار ہوتے تھے مگر پیٹ کی مار سب سے بڑی مار ہے۔ اس لیے دلّی کے لوگ بھی یہ ساری مصیبتیں جھیل کر دلّی سے چل دیئے۔ کوئی عظیم آباد (پٹنہ) پہنچا۔ کسی نے ٹانڈے کا رخ کیا اکثر لوگوں نے اودھ جا کر پناہ لی۔ اودھ اس زمانے میں شمالی ہندوستان کا سب سے خوشحال اور پرامن علاقہ تھا۔ وہاں اس زمانے میں نواب شجاع الدّولہ کی حکومت تھی۔ شجاع الدولہ کے بعد جب آصف الدّولہ تخت پر بیٹھے تو انھوں نے لکھنؤ کو اپنی راجدھانی بنایا۔ آصف الدّولہ شاعروں اور فنکاروں کے بڑے قدرداں تھے اور اسی کے ساتھ قدرت نے ان کو بڑا فیاض دل دیا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں یہ کہاوت مشہور تھی کہ "جسے نہ دے مولا۔ اسے دے آصف الدّولہ"۔ لکھنؤ میں امن و سکون بھی تھا اور دولت کی فراوانی بھی۔ وہاں باہر سے حملہ کرنے والوں کا ڈر نہ تھا۔ جس کی وجہ سے دلی والوں کی راتوں کی نیندیں اور دن کا سکون حرام تھا۔ یہاں کے حاکم، منتظم اور ملکی اور سیاسی معاملات میں سمجھ دار تھے۔ اسی لیے کسی قسم کی اندرونی بدنظمی اور گڑبڑ بھی نہ تھی۔ بس پھر تو دہلی کے پناہ گزینوں کو لکھنؤ ہی میں سب سے

[1] گور: قبر

زیادہ عافیت نظر آئی اور بہت لوگ مثلاً میر، سودا، مصحفی، انشا زمانے کے گرم و سرد سہتے ہوتے بالآخر لکھنؤ ہی پہنچے۔ اس کے علاوہ جس کے جہاں سینگ سمائے وہاں چلا گیا۔ صرف ایک خواجہ میر درد ایسے شخص تھے جنھوں نے دہلی چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ انھیں خدا پر بھروسہ تھا۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ جو قسمت میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ پھر در بدر کی ٹھوکریں کھانے سے کیا فائدہ۔ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ وہ کہیں بھی حفاظت کر سکتا ہے۔

ایک قصہ مشہور ہے کہ کسی شخص نے روزی کی تلاش میں پردیس جانے کا ارادہ کیا۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ اپنے گرو کے پاس آیا اور اجازت چاہی گرو نے کہا جب تم پردیس پہنچو تو وہاں کے خدا سے ہمارا سلام کہہ دینا۔" اس شخص نے کہا۔ حضرت! کیسی بات فرماتے ہیں۔ یہاں کا اور وہاں کا کوئی خدا الگ الگ ہے؟ گرو نے کہا کہ جب دونوں جگہ ایک ہی خدا ہے تو وہاں جا کر کیا مل جائے گا۔ یہیں بیٹھ کر خدا سے مانگو جو کچھ مانگنا ہے۔

خیر ذکر یہ ہو رہا تھا کہ خواجہ میر درد بڑی ہمت کے ساتھ اپنی خانقاہ میں زندگی گذارتے رہے۔ مگر دہلی کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے الفاظ میں اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے۔

"ملک کی بربادی، سلطنت کی تباہی۔ آئے دن کی غارت اور تاراج[1] کے سبب سے اکثر امراء اور شرفاء کے گھرانے شہر چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے۔ مگر ان کے پائے استقلال[2] کو جنبش نہ آئی۔ اپنے اللہ پر توکّل[3] رکھا اور جو سجادہ بزرگوں نے بچھایا اس پر بیٹھے رہے۔

یہ سب تو تھا مگر ان حالات سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ کوئی بے حس اور نادان ہی ایسے حالات سے اثر لیے بغیر رہ سکتا تھا۔ چنانچہ خواجہ میر درد کی شاعری میں دنیا کی ناپائداری، بے ثباتی اور عبرت کے جو مضامین کثرت سے ملتے

[1] تاراج: تباہی
[2] پائے استقلال: ثابت قدمی
[3] توکل: بھروسہ

ہیں۔ ان کی وجہ یہی حالات ہیں اور ان حالات ہی نے ان کو دنیاوی مال و
دولت اور شان و شوکت سے بیزار کر دیا تھا۔
اسی کے ساتھ یہ بات بھی عجیب ہے کہ اس زمانے میں اگر ایک طرف
حکومت اور سیاست ڈانواں ڈول تھی اور اس کی عمارت روز بروز ٹوٹتی جا رہی
تھی تو دوسری طرف شعر و ادب، علم و فن کو ترقی ہو رہی تھی۔ کچھ ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ شاید شعر و ادب کی ترقی کے لیے سیاسی اور سماجی زوال
لازمی ہے۔ اس وقت شاید شاعر اپنی تھکن کو شعر و نغمہ سے دور کرنا چاہتا ہے
تاریخ سے پوچھو تو بتائے گی اس وقت جب نادر شاہ اور احمد شاہ کے
حملوں سے دلّی کے در و دیوار گونج رہے تھے اس وقت میر درد اور سودا کے
نغمے زمین شعر کی آبیاری[1] کر رہے تھے اور جب بہادر شاہ ظفر کو جلا وطن کیے
جانے کی تیاری تھی اور انگریزوں کے قدم ہندوستان میں مضبوط ہو رہے تھے۔
اس وقت غالب، مومن، ذوق آسمان شاعری پر چمک رہے تھے۔ کسی سے اگر یہ
پوچھا جائے کہ شعر و ادب کا سنہرا دور کون سا ہے تو وہ بے اختیار اسی زمانے کو کہے
گا جو خواجہ میر درد کا ہے۔ صرف دہلی میں اتنے شاعر، ادیب اور فنکار جمع ہو گئے
تھے کہ زمانے نے لاکھ ترقی کی مگر اس درجہ کے لوگ پھر نظر نہ آئے۔

خاندان

خواجہ میر درد کے ماں باپ دونوں سادات خاندان سے تھے۔ یہ وہ
خاندان ہے جس کو مسلمانوں میں سب سے زیادہ باعزّت اور بزرگ خیال کیا
جاتا ہے۔ چونکہ اس خاندان کا سلسلہ رسول اللہؐ کے خاندان سے جا کر مل جاتا ہے
خواجہ میر درد کے ننھیال اور ددھیال دونوں میں بڑے بڑے بزرگ گذرے
تھے اور کئی نسلوں سے ان کے خاندان میں قرآن، حدیث اور مذہبی علوم پڑھانے
کا سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ برسوں سے یہ خاندان بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ بتا کر اور خدا

[1] آبیاری۔ سینچائی

اور رسول کا فرماں بردار بنا کر دین کی خدمت کرتا چلا آ رہا تھا۔ ان کے ددھیالی
بزرگ حضرت خواجہ بہاء الدین نقش بند، بخارا کے مشہور صوفی اور عالم تھے
جن کا سلسلہ آج تک چل رہا ہے اور صوفیوں کا ایک گروہ جو آج تک
ان کے خیالات اور ان کے بتاتے ہوتے راستہ پر چلتا ہے۔
اپنے کو ان کے نام سے منسوب کر کے نقش بندی کہتا ہے۔
اسی طرح ان کے ننھیالی بزرگ حضرت عبدالقادر جیلانی بہت
بڑے عالم تھے جن کو ہم سب غوث پاک یا بڑے صاحب
کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جن کو ساری زندگی اسلام کی
خدمت، مسلمانوں کی ہدایت، اللہ اور اس کے بندوں
کی خدمت اور محبت میں گذری۔ ان کا مزار بغداد (عراق) میں ہے۔
ہزاروں لوگ وہاں زیارت کو جاتے ہیں۔ ان سب کے ذکر کرنے سے مقصد
یہ ہے کہ درد کا تعلق کتنے بڑے خاندان اور بزرگ ہستیوں سے تھا۔ ان کے خاندان
نے دنیاوی بڑائی حاصل کرنے کی یا بڑے سرکاری عہدے اور ملازمتیں پانے
کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ ان پڑھ اور ناسمجھ لوگوں کو علم کی روشنی دیتے رہے اور
اپنے مدرسوں اور خانقاہوں سے نکل کر کبھی کسی بادشاہ یا امیر کے دربار میں حاضری
دینے نہ گئے۔
خواجہ میر درد کے پردادا خواجہ محمد طاہر اورنگ زیب کے زمانے میں بخارا سے
دہلی آئے۔ اورنگ زیب جو عالموں اور درویشوں کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے
انھیں اور ان کے بیٹوں کو بڑی عزّت اور احترام سے اپنے دربار میں جگہ دی۔ ان
کے بیٹوں کو اعلیٰ عہدے دئیے اور شاہی خاندان میں ان کی شادیاں ہوئیں۔
مگر خواجہ طاہر کے چھوٹے بیٹے فتح اللہ خان نے شاہی خاندان میں شادی کرنے کی
بجائے ایک ایسی لڑکی سے شادی کی جو انہی کی طرح سیّد خاندان سے تعلّق رکھتی
تھی۔ انہی کی اولاد میں خواجہ میر درد تھے۔
میر درد کے والد کا نام خواجہ ناصر تھا اور عندلیب تخلّص کرتے تھے۔ انھوں
نے اپنے باپ دادا کے منصب اور عہدہ کو چھوڑ کر گوشہ نشینی اور درویشی کی

زندگی اختیار کی اور فقیروں، اللہ والوں کے ساتھ اپنا وقت گزارتے۔ اس زمانے کے ایک بزرگ (خواجہ محمد زبیر) کے مرید ہو کر لوگوں کو روحانیت اور درویشی کی تعلیم دینے لگے۔ وہ اپنے پیر خواجہ محمد زبیر کی صحبت میں رہ کر روحانیت کے بہت اونچے درجے تک پہنچ گئے۔ انھوں نے تصوّف کے موضوع پر فارسی میں کئی کتابیں لکھی ہیں اور تصوّف میں بہت سے نئے خیالات کا اضافہ کیا ہے۔ ان کا طریقہ "طریقۂ محمدیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ خواجہ میر درد بھی اسی طریقہ پر چلے اور اس کی تلقین کی اور ساری زندگی اپنے باپ کی طرح دین کی باتیں سکھانے اور خدا کی یاد میں گزاری۔

پیدائش اور تعلیم

خواجہ میر درد کا سن پیدائش ۱۱۳۳ھ ہے۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح اسکول اور یونیورسٹیاں تو تھیں نہیں۔ جن لوگوں کو علم حاصل کرنے کا شوق ہوتا وہ کسی بڑے عالم یا استاد کے شاگرد بن جاتے اور اس سے علم حاصل کرتے۔ خواجہ میر درد نے بھی اس زمانے کے دو استادوں سے فارسی زبان و ادب کا سبق لیا۔ یہ دو استاد مفتی دولت اور سراج الدین خاں آرزو تھے۔ مولانا آرزو اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے اور میر تقی میر کے ماموں تھے۔ اس زمانے میں کوئی شخص اس وقت تک ماہر نہ سمجھا جاتا تھا جب تک اس نے خان آرزو سے نہ پڑھا ہو۔ اس کے علاوہ درد نے اپنے والد خواجہ ناصر عندلیب سے اپنی تعلیم مکمل کی اور مذہبی علوم جیسے علم قرآن، علم حدیث[1]، تفسیر[2]، فقہ[3]، تصوّف[4] میں مہارت حاصل کی۔ اسی کے ساتھ انھیں موسیقی سے بھی بے حد لگاؤ تھا۔ وہ خود اس کے ماہر تھے۔ چنانچہ اس زمانے کے بڑے بڑے موسیقاران سے اس فن کی تعلیم لینے آتے تھے۔ یہ شوق بھی ان کو اپنے والد سے ملا تھا۔ ان کے گھر پر

---

[1] حدیث: رسول اللہ کے اقوال اور عمل [2] تفسیر قرآن کی وضاحت [3] فقہ۔ مذہبی قانون
[4] تصوّف۔ خدا سے لو لگانے کا ایک علم

ہر مہینہ کی دوسری اور چوبیس تاریخ کو سماع[1] کی محفل ہوتی تھی جس میں بڑے موسیقار اور قوّال اپنے کمالات دکھاتے تھے۔ ان محفلوں میں بڑے بڑے امیر وزیر یہاں تک کہ بادشاہ خود شریک ہوتے۔ اس محفل میں نعت[2] اور منقبت[3] کے اشعار پڑھے جاتے۔ محفل میں شریک ہوتے وہ بہت ادب سے دو زانو ہو کر اس محفل میں شریک ہوتے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ غیر متعلق بات کر لے یا کسی چیز کا سہارا لے کر آرام کر سکے۔

ملازمت

شروع میں درد نے شاہ عالم بادشاہ کی فوج میں نوکری کی اور سپاہی پیشہ اختیار کیا۔ لیکن اس پیشہ کے لیے جو سخت مزاجی، حاکمانہ انداز۔ جاہ و جلال اور رعب ضروری ہے وہ ان کے اندر نہ تھا۔ وہ تو شروع ہی سے عبادت، گوشہ نشینی اور نرم دلی کو پسند کرتے تھے۔ آخر کچھ عرصہ کے بعد ہی اس ملازمت سے بد دل ہو کر سبکدوش ہو گئے۔ ان کے والد نے بھی اس فیصلہ کو پسند کیا۔ اس لیے کہ ان کو بھی اندازہ تھا کہ یہ پیشہ بیٹے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ان کی نگاہیں بیٹے کے اس مستقبل کی طرف تھیں۔ جہاں اس کے بوریئے پر بڑے بڑے امیر دو زانو بیٹھے ہوں گے اور یہ فقیری میں بھی لوگوں کے دلوں پر بادشاہی کرے گا۔ چنانچہ انتیس برس کی عمر میں دُنیا کو چھوڑ کر درویشی کی زندگی اختیار کی اور دنیاوی شان و شوکت اور جاگیر و منصب کا خیال دل سے بالکل نکال دیا۔ اپنی باقی زندگی خدا کی یاد اور اس کے بندوں کو راہ ہدایت دکھانے میں گزار دی۔

سجّادہ نشینی

جس طرح ایک بادشاہ کے انتقال پر اس کی جگہ اس کے بیٹے کو تخت پر

---

[1] سماع۔ گانا بجانا [2] نعت۔ رسول کی تعریف میں اشعار [3] منقبت۔ رسول کے صحابہ کی تعریف میں اشعار

بٹھایا جاتا ہے اور اس کی تخت نشینی کا جشن منایا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی
بزرگ اور درویش دنیا سے گذر جاتا ہے یا کسی وجہ سے اپنی زندگی ہی میں اس
جگہ سے ہٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ کسی شاگرد، مرید یا اولاد میں سے کسی
کو منتخب کر لیا جاتا ہے تو اس کو سجادہ نشینی کہتے ہیں۔ درد کے والد خواجہ عندلیب
نے جب وفات پائی تو درد کی عمر انتالیس سال تھی اور ان کے دوسرے بھائی
خواجہ میر اثر درد سے چھوٹے تھے۔ درد عمر میں بڑے تھے اور مذہب و علمیت
میں بھی ان کا درجہ بلند تھا۔ اس لیے باپ کے انتقال کے بعد انہی کو باپ کی
جگہ پر بٹھایا گیا۔ درد نے اپنی باقی عمر بڑے ہی پاکیزہ اور درویشانہ انداز میں بسر کی
ہزاروں لوگوں نے ان سے ہدایت حاصل کی۔ اور ان کے خاندان میں تعلیم اور
ہدایت کا یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہا۔ درد کے انتقال کے بعد ان کے بھائی
میر اثر اور پھر ان کے بیٹے خواجہ ضیاء الناصر الم اور اس کے بعد ان کے نواسوں نے
اس سلسلہ کو جاری رکھا۔

سیرت اور شخصیت

درد غیر معمولی خوبیوں کے آدمی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کی شخصیت اور
مزاج پر اس کے خاندان کا اور گھریلو حالات کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اسی لیے
آدمی کی عادتیں دیکھ کر اس کے خاندان اور سماجی مرتبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا
ہے۔ درد کا تعلق سیّدوں کے ایک اعلیٰ گھرانے سے تھا۔ جن کے ماحول میں
مذہب سے دلچسپی اور خدا کی محبت بسی ہوئی تھی۔ جن کے باپ دادا مغل دربار
میں اونچے عہدوں پر رہے تھے اور دنیاوی شان و شوکت ان کے قدم
چومتی تھی۔ مگر اس کے باوجود درد کی طبیعت میں خوفِ خدا، مذہب کی
پابندی، رحم اور ہمدردی، بے نیازی اور درویشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی
تھی۔ ان کی شخصیت کی بلندی اور خوش اخلاقی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے
کہ اس زمانے کے جتنے بھی تذکرہ لکھنے والے ہیں سب نے درد کا ذکر بڑے
اچھے الفاظ میں کیا ہے اور ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے درد کی

کسی کمزوری یا برائی کی طرف اشارہ کیا ہو جبکہ ان میں بعض تذکرہ لکھنے
والے ایسے بھی تھے کہ انھوں نے دل کھول کر تعریف کرنا اپنی شان کے خلاف
سمجھا اور کسی کی کوئی کمزوری بھی نظر آتی تو اس کو ضرور نمایاں کیا۔ مگر درد
کی بزرگی اور نیکی کے سامنے سب کی گردن جھکی نظر آتی ہے اور سب نے
ایک آواز ہو کر ان کی تعریف کی ہے۔ میر تقی میر جو بہت کم کسی کی تعریف کرتے
تھے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں درد کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"وہ (درد) بزرگ ہیں اور بزرگ کے بیٹے ہیں۔ جوان صالح
ہیں۔ درویشی میں انھیں بہت بڑا درجہ حاصل ہے۔ مجھ فقیر کو ان کا
خاص قرب اور عقیدت حاصل ہے۔ ویسے ان کا حسنِ سلوک ہر
ایک کے لیے عام ہے۔ انھوں نے دنیاوی عزت کی خواہش کو
دل سے نکال دیا ہے"

میر حسن نے اپنے تذکرہ شعرائے اردو میں انھیں "عالم خوش، دل درویش
نکو صفات اور آسمان سخن کا آفتاب کہا ہے۔ غلام ہمدانی مصحفی جوان کے
زمانے کے مشہور شاعر ہیں اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"سبھی عجیب و غریب فنون کے ماہر، فقر، توکل اور بے نیازی میں
بے مثال ہیں"

خواجہ میر درد اپنے اصولوں کی خاطر بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی خاطر
میں نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ ان کے بارے میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک
مرتبہ بادشاہ شاہ عالم ان کی محفل میں شریک تھے۔ جیسا کہ مذہبی محفلوں میں
بیٹھنے کا قاعدہ ہے۔ سب لوگ گھٹنے تہہ کیے ہوئے (دوزانو) بیٹھے تھے۔ بادشاہ
نے پیر سیدھے کر لیے۔ درد نے فوراً اس پر اعتراض کیا کہ فقیروں کی محفل میں
اس طرح نہیں بیٹھا جاتا۔ بادشاہ نے پیر کی تکلیف کا عذر کیا تو انھوں نے کہا کہ
طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو محفل میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ تاریخی اعتبار سے
یہ واقعہ خواہ درست ہو یا غلط۔ مگر خواجہ میر درد کی شخصیت سے یہ بعید نہ تھا کہ
وہ بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر وہ بات نہ کہیں جس کو وہ

درست خیال کرتے اور اسی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ان کی محفل میں امیر اور غریب کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ ان کا برتاؤ دونوں کے لیے یکساں تھا۔

خودداری اور درویشی

میر درد کا زمانہ بادشاہوں کی حکومت کا زمانہ تھا۔ امیروں اور وزیروں کے اپنے الگ دربار ہوتے تھے اور ان درباروں سے جہاں سپاہی، فوج اور دوسرا عملہ وابستہ ہوتا تھا۔ وہاں شاعر بھی وابستہ ہوتے تھے۔ شاعر اس بادشاہ یا امیر کی شان میں قصیدے میں مبالغہ کے ساتھ اس کی تعریف کرتے جس پر خوش ہو کر بادشاہ ان کو انعامات سے نوازتا۔ اس زمانے میں سودا تو خیر قصیدے کے لیے مشہور تھے ہی۔ میر نے بھی جو اپنی بے نیازی اور خودداری کے لیے مشہور ہیں۔ وزیروں اور امیروں کے دربار میں ملازمت کی اور انعام واکرام کی امید میں آصف الدولہ کے دربار تک پہنچے اور ان کی شان میں قصیدے لکھے۔ صرف ایک درد کی ذات تھی جنھوں نے نہ کبھی کسی بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ لکھا نہ کسی کے دربار میں حاضری دی۔ بلکہ اگر کسی بادشاہ نے بلایا تو انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بد دماغ یا مغرور تھے بلکہ انھوں نے دنیا کی محبّت اور لالچ کو اپنے دل سے نکال دیا تھا۔ جس شخص نے خدا کی محبّت میں اپنی نوکری سے استعفےٰ دے دیا ہو۔ اپنے باپ دادا کی جاگیر کو چھوڑ دیا ہو اس کو دولت کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ لہٰذا انھوں نے نہ کسی امیر اور وزیر کی خوشامد کی اور نہ کسی کے دربار میں جانا گوارا کیا۔ وہ ایک سچّے اور پکّے مسلمان تھے اور خدا کے سوا کسی کے آگے اپنی ضرورت لے جانے اور سوال کرنے کو اپنے لیے شرم کی بات سمجھتے تھے۔ نوکری وہ پہلے ہی چھوڑ چکے تھے۔ کسی سے مدد مانگنا ان کی خودداری اور عزت کے خلاف تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ان کو اور ان کے خاندان والوں کو فاقہ کرنا پڑتا تھا اور کئی کئی روز کھانے کو کچھ نہ ملتا۔ ان کے نواسے ناصر نذیر فراق نے درد کے حالات ایک کتاب میں لکھے ہیں جس کا نام "میخانۂ درد" ہے اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ تو آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو اکیس روز تک کچھ کھانے کو نصیب نہ ہوا اور سب لوگ فاقہ سے رہے لیکن ان پریشانیوں نے بھی ان کی خودداری کو کم نہ کیا۔ آپ نے ہر تکلیف برداشت کی مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کے خاندان کی جو عزت لوگوں کے دلوں میں تھی وہ کسی وزیر اور بادشاہ کی بھی نہ تھی۔

خدا پر بھروسہ اور ثابت قدمی

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ دلّی میں رہنا جان کو خطرہ میں ڈالنا تھا۔ چنانچہ جس کو کہیں ذرا سا بھی سہارا نظر آتا وہ وہاں روانہ ہو جاتا۔ میر درد اگر چاہتے تو وہ بھی دلّی چھوڑ کر کسی اور شہر میں جا کر آرام کی زندگی بسر کر سکتے تھے کیونکہ ان کے خاندان کی بزرگی کی شہرت سب جگہ پہنچ چکی تھی اور ہر جگہ ان کے عقیدت مند اور ماننے والے موجود تھے جو انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے مگر انھوں نے اپنے باپ دادا کی جگہ کو چھوڑنا پسند نہ کیا۔ بڑے بڑے طوفان آئے۔ قتل و خون کی آندھیاں اٹھیں۔ مگر وہ اپنی جگہ پر قائم رہے۔ یہ دراصل ان کے ایمان کی قوّت تھی کہ خدا کی مرضی کے بغیر کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور جب خدا مہربان ہو تو کوئی دشمن بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اگر قسمت میں تباہی ہے تو پھر کہیں بھی چلے جائیے اس سے بچنا ممکن نہیں۔ ان کے ان اشعار میں اس خیال کا اظہار پایا جاتا ہے:

نہ مطلب ہے گدائی سے نہ یہ خواہش کہ شاہی ہو
الٰہی ہو وہی جو کچھ کہ مرضی الٰہی ہو

کیا کام مجھے خوف و رجا سے کہ میرے پاس
ہے جان سو بے جان، دل ہے سو غنی ہے

نہ ہم کچھ آپ طلب، نے تلاش کرتے ہیں
جو کچھ کہ یاں ہے مقدّر معاش کرتے ہیں

ویسے تو اس طرح کے دعوے اور باتیں ہم کو بہت سے شاعروں کے یہاں مل جائیں گی مگر جب ہم ان کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو صورتِ حال اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ زبانی طور پر جو لوگ قناعت اور خودداری کی تعلیم دیتے ہیں مگر زندگی میں وہ بڑے لوگوں کی خوشامدیں کرتے اور درباروں میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے اور نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ زبان سے محبّت اور انسانیت کی تلقین کرتے ہیں۔ مگر

زندگی نفرت اور بد اخلاقی کا نمونہ ہوگی۔ غرض یہ کہ اکثر شاعروں پر وہ مثل سچی ہے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں۔ مگر دردؔ کے یہاں یہ بات نہیں ہے انھوں نے جو کچھ کہا وہ کر کے بھی دکھایا ہے۔ وہ خدا پر بھروسہ کرنے اور ہر حال میں مگن رہنے کی نصیحت دوسروں کو ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی زندگی انہی خصوصیات کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔

خواجہ میر درد کی ہمت اور جرأت کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ انھوں نے خراب سے خراب حالات میں بھی دہلی کو نہیں چھوڑا۔ اسی کے ساتھ ان کے یہاں وہ جرأت اور حق گوئی بھی ہے جس کا ذکر اقبال کے اس شعر میں ملتا ہے۔

بندۂ مومن کا دل بیم[1] و ریا[2] سے پاک ہے   قوت فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

درد کے حالات لکھنے والوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ وہ حق بات کہنے میں کبھی کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ بادشاہوں اور امیروں نے ان کو اپنے دربار میں بلانا چاہا مگر انھوں نے ہمیشہ یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ بادشاہوں کے دربار میں فقیروں کا کیا کام۔ جس کو غرض ہو وہ خود ملنے آجائے۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں کہ اگر انسان میں ہمت ہو تو وہ فقیری میں بھی بادشاہت کر سکتا ہے حکومت کا تعلق تاج و تخت سے نہیں بلکہ دل سے ہے۔

ہمت رفیق ہووے تو فقر سلطنت ہے
آتا ہے ہاتھ یعنی یاں تخت دل کے ہاتھوں

اخلاق اور خاکساری

گذشتہ صفحات میں جو واقعات بیان کیے گئے ان سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ دردؔ بد مزاج اور بد دماغ تھے جو کسی سے اچھی طرح بات بھی نہیں کرتے تھے۔ درد کا اخلاق دوسرے اکثر صوفی بزرگوں کی طرح بہت اونچا تھا۔ وہ ہر ایک سے جھک کر ملتے تھے اور بڑی عاجزی سے پیش آتے تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ کیوں ان کی طرف کھنچے چلے آتے بد دماغ آدمی کے دوست کم اور دشمن زیادہ ہوتے ہیں مگر ہم نے دیکھا کہ درد کا کوئی بھی دشمن یا مخالف نہیں تھا۔ ہر شخص ان کے اخلاق کی

---

[1] بیم: خوف   [2] ریا: دھوکہ۔ ظاہر داری

تعریف ہی کرتا تھا۔ چنانچہ میر تقی میر ان کو "خلیق، متواضع اور دوست آشنا" کہتے ہیں اور ان کے حسن سلوک کو سب لوگوں پر عام بتاتے ہیں۔ میر حسن ان کو "عالم خوش ذات اور درویش نکو صفات" کہتے ہیں۔

غرض ان کے عہد کے سارے لوگ ان کے اخلاق کی تعریف ہی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

بادشاہ سے اس طرح رکھائی سے پیش آکر وہ صرف یہ دکھانا چاہتے تھے کہ اللہ والوں کی نظر میں دولت اور حکومت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور ان کی نظر میں امیر اور غریب سب ایک ہیں۔ وہ بادشاہ اور امیروں سے اگر سینہ تان کر ملتے تھے تو چھوٹے لوگوں سے بہت زیادہ اخلاق برتتے تھے۔ مولانا حالی کے الفاظ ہیں۔

خاک روؤں سے خاکساری تھی
سر بلندوں سے انکسار نہ تھا

بلکہ وہ تو ان لوگوں میں تھے جو انسان سے محبت اور نیکی کو خدا کی عبادت سے بھی زیادہ اہم مانتے تھے۔ ان کے نیچے دیئے ہوئے اشعار میں اسی خیال کا اظہار ہوا ہے۔

یارب دوست گو نہ رہوں تیرے عہد پر
بندہ سے پر نہ ہو کوئی بندہ شکستہ دل

کعبہ کو بھی نہ جائیے دیر[1] کو بھی نہ کیجیے منہ
دل میں کسی کے در دیاں ہووے تو راہ کیجیے

جوں آئینہ منہ کسی سے مت پھیر   تیرے دل میں اگر صفا ہے

اپنی خود ستائی اور دوسروں کی خدمت سے پرہیز

اردو کے اکثر شاعروں میں ایک کمزوری یہ پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی تعریف کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس تعریف میں حقیقت بھی ہے تو مبالغہ کے ساتھ اور اس پر وہ فخر کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم دردؔ کی شاعری پڑھتے ہیں تو ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ

---

[1] دیر: مندر

ان کے یہاں یہ خودستائی نہیں ہے۔ اگر کہیں اپنی یا اپنی شاعری کی تعریف بھی کی ہے تو اس میں بھی میانہ روی ہے۔ انھوں نے اپنے "دل آگاہ، اور ایمان کی تعریف ضرور کی ہے مگر ان کا لب و لہجہ یہ ہے۔

نہ یاں علم و دانش نہ فضل و ہنر — فقط ایک دل ہے کہ آگاہ ہے
ایک ایمان ہے بساط اپنی — نہ عبادت نہ کچھ ریاضت ہے

انھوں نے اپنے اشعار کے بلند معنی اور اثر کی تعریف ضرور کی ہے لیکن اس تعریف سے دوسروں کو گھٹانا یا ذلیل کرنا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ اشارتاً بھی کوئی چیز ایسی نہیں ملے گی جس کو کوئی شخص اپنے اوپر الزام خیال کرے۔ اس کا سبب درد کی صلح پسند طبیعت ہے۔ کسی کو برا کہنا یا برا سمجھنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ تو ان لوگوں کو بھی برا نہیں کہتے جنھوں نے انھیں نیچا دکھانے کی کوششیں کیں اور ان کی شاعری کا مذاق اڑایا جس میں ایک مثال مرزا سودا کی ہے۔ وہ بڑے تیز مزاج اور سپاہی پیشہ تھے۔ ان کا قلم تلوار کی طرح چلتا تھا۔ جس سے ذرا ناراض ہوتے تو غلام غنچہ سے قلمدان منگوا کر اسی وقت اس کی برائی میں شعر لکھ دیتے۔ چنانچہ سودا نے ایک قصیدے کے شروع میں اپنے زمانے کے تمام شاعروں خاص طور پر درد کی شاعری کا مذاق اڑایا ہے۔ اس کے تین اشعار یہ ہیں۔

دردؔ کس کس طرح بلاتے ہیں — کرکے آواز منحنی[1] و حزیں[2] بس
اور احمق جو ان کے سامع[3] ہیں — دم بدم ان کی کرتے ہیں تحسین[4]
جو کوئی پوچھتا ہے عالم میں — فخر کس چیز کا ہے ان کے تئیں

کوئی اور شاعر ہوتا تو وہ بھی میدان میں ڈٹ جاتا۔ میر ضاحک اور میر تقی کی طرح سودا کی شاعری ہی کو نہیں بلکہ ان کی سات پشتوں تک کو نہیں بخشتا مگر میر درد کی درویشانہ طبیعت نے اس بات کو گوارا نہ کیا۔ انھوں نے صرف اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔

سوداؔ اگرچہ دردؔ خاموش ہے ولے — جوں غنچہ سو زباں ہے اس کے دہن کے بیچ

[1] منحنی = کمزور [2] حزیں = غمگین [3] سامع = سننے والے [4] تحسین = تعریف

موسیقی سے دلچسپی

ہمارے یہاں ہندوستان میں صوفیوں اور بزرگوں کے دو سلسلے زیادہ مشہور ہیں۔ ایک تو نقش بندی بزرگوں کا سلسلہ ہے جو شرع کے حکم کے بہت سختی سے پابند ہیں اور مذہب اسلام میں چوں کہ گانے بجانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس لیے اس کو ناجائز بتاتے ہیں۔

دوسرے چشتیہ سلسلے کے لوگ ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی سے ان کی نسبت کہی جاتی ہے۔ یہ لوگ گانے کو ناجائز نہیں سمجھتے اور مذہبی محفلوں میں باجے، قوالی اور سماع کو پسند کرتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ ہم حضرت نظام الدین اولیا یا حضرت معین الدین چشتی کے عرس میں کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ موسیقی سے انسان کی روح کو لگاؤ ہے اور اس کے ذریعے دلوں میں خدا کا عشق اور بزرگوں کی محبت جاگ جاتی ہے۔ اسی لیے ان کی محفلوں میں گانے بجانے کا خاص انتظام رہتا ہے۔

خواجہ میر درد کا تعلق خاندانی اور پیروں کے اعتبار سے نقشبندیہ سلسلے سے تھا اور انھوں نے اپنی کتاب "نالۂ درد" میں صاف لکھا ہے کہ "میں اپنے بزرگوں کے طریقہ کو صحیح سمجھتا ہوں اور موسیقی کو عبادت یا اچھی چیز نہیں خیال کرتا مگر میں اپنے شوق سے مجبور ہوں اور اس کو اللہ کی جانب سے سمجھتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں کبھی گانے والوں کو بلاتا نہیں وہ لوگ خود آتے ہیں اور جب تک جی چاہتا ہے گاتے ہیں"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں موسیقی سے کس قدر دلچسپی تھی کہ اسے مذہباً اچھا نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کے دلدادہ تھے۔ وہ بھی بہرحال انسان تھے اور اپنے شوق سے مجبور۔ ان کو صرف موسیقی سننے کا ہی شوق نہ تھا بلکہ وہ خود بھی اس کے ماہر تھے اور بڑے بڑے گویّے اور استاد ان کے پاس اس لیے فن کا اظہار کرنے آتے تھے تاکہ ان کے مشورے سے اپنی غلطیاں درست کرلیں۔ ان کے یہاں ہر مہینہ سماع کی محفلیں ہوتیں۔ محرم میں سوزخوانی[1] اور مرثیہ خوانی ہوتی۔

[1] سوز خوانی = مرثیہ پڑھنے کا ایک انداز

مذہب سے لگاؤ

درد کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی مذہبیت اور خدا شناسی ہے۔
ان کی یہ مذہبیت ان کی زندگی کے دوسرے شعبوں پر چھائی ہوئی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ درد کی پیدائش ایک ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جہاں مذہب اوڑھنا بچھونا تھا۔ جہاں شروع ہی سے قرآن اور سنّتؔ کی پابندی سکھا دی جاتی تھی۔ ان کے گھر والے نہ صرف خود مذہب کے پابند تھے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیتے تھے۔ درد کی شخصیت کا بھی انداز وہی رہا جو ان کے والد کا تھا۔ انھوں نے اپنے والد سے علم القرآن، تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوّف کی تعلیم حاصل کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ خود ان کی زندگی ان تعلیمات کا نمونہ بن گئی۔ درد ایک پختہ عقیدہ کے باعمل انسان تھے۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کو تو مذہب کی تعلیم دیتے ہیں، مگر خود اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ تم نے وہ لطیفہ تو سنا ہوگا کہ ایک مرتبہ ایک مولوی صاحب تقریر کر رہے تھے کہ اگر کسی کو کھیر پکا کر کھلائی جائے اور سب میں تقسیم کی جائے تو خدا بہت خوش ہوتا ہے اور اس کے لیے جنت میں ایک گھر کی خوشخبری ہے۔ یہ تقریر وہ اس لیے کر رہے تھے کہ خود ان کو کھیر بہت پسند تھی۔ سوچا کہ لوگ پکائیں گے تو مجھے بھی ضرور بھیجیں گے۔ اتفاق دیکھو کہ ان کی بیوی بھی یہ تقریر سن رہی تھیں۔ وہ بے چاری سیدھی سادی عورت۔ سوچا کہ یہ تو جنّت میں گھر بنانے کا آسان طریقہ ہے۔ فوراً گھر جا کر بہت سی کھیر پکانے کا سامان منگالیا۔

مولوی صاحب جب واپس آئے اور یہ سامان دیکھا تو بولے کہ "نیک بخت! تم بھی غضب کرتی ہو۔ وہ بات تو محلّہ والوں کے لیے تھی۔ تم کو اس پر عمل کرنا لازمی نہیں ہے۔ مگر بیوی نہ مانیں اور کھیر پکانے پر اصرار کرنے لگیں۔ مولوی صاحب نے دیکھا کہ بیوی کسی صورت نہیں مانتیں تو انھوں نے کنوئیں میں گر کر مرنے کی دھمکی دی۔ بیوی نے کہا۔ خواہ تم زندہ رہو یا مرو۔ میں تو کھیر ضرور پکاؤں گی۔ تم چاہتے ہو کہ میں جنت میں نہ جاؤں۔ آخر جب مولوی صاحب واقعی کنوئیں میں کودنے کو

ؔ سنّت = وہ طریقہ جو رسول اللہ نے اختیار کیا۔

ہوئے تو بیوی نے چیخ ماری کہ "ہائے! مولوی صاحب تو مرنے جا رہے ہیں۔ اب میں کس کے لیے جیوں گی۔ یہ کہہ کر گھر کی ساری چابیاں محلہ والوں کے حوالے کر دیں کہ تم لوگ جو چاہو لے لینا۔ مجھے مال و دولت کا کیا کرنا۔ مولوی صاحب نے دیکھا کہ ابھی تک تو کھیر کے خرچ کی بات تھی اور اب سارا سامان ہی جا رہا ہے تو جھٹ واپس آئے اور چابیاں اٹھا کر بولے کہ نیک بخت! میرے مرنے پر تو سارا مال و اسباب ہی یوں لٹا دیگی۔ تو پھر میں مرنے سے باز آیا۔ اس قصے سے بتانا یہ مقصود ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی باتیں محض دکھاوے کی ہوتی ہیں اور ان کی اپنی زندگی میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر خواجہ میر درد ایسے بزرگ نہ تھے۔ ان کی زندگی ان کی تعلیمات کا نمونہ تھی اور ان کی تعلیمات وہی تھیں جن کے لیے خدا اور اس کے رسولؐ نے حکم دیا تھا۔ نماز، روزہ اور دوسری عبادات کے علاوہ ان کا بلند اخلاق ان کی سچّی مذہبیت کا ثبوت ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی شاعری کو دیکھ ڈالیے اس میں فضول، بے ہودہ اور بے کار باتیں نہیں ملیں گی۔ ان کے اشعار میں بھی وہی پاکیزگی اور اخلاق نظر آتا ہے۔ جو ان کی زندگی میں تھا۔

وفات اور مزار

۱۱۹۹ھ میں اردو کے اس درویش شاعر نے دہلی ہی میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر چھیاسٹھ سال کی تھی۔ ان کے ولی ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے ۱۱۹۹ھ میں ایک رسالہ "دردِ دل"، لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا۔

"یہ میری عمر کا چھیاسٹھواں سال ہے۔ خیال ہے کہ یہ عمر کا آخری سال ہوگا۔ میرا خاتمہ اور رسالہ کا مکمل ہونا ایک ساتھ ہوگا۔ میرے والد کی عمر بھی چھیاسٹھ سال ہی ہوئی تھی اور "اللہ"، کے نام کے اعداد بھی چھیاسٹھ ہیں۔ اسی نام پر ہر مومن کا خاتمہ ہونا چاہیے"

ان کی پیشن گوئی پوری ہوئی اور ان کا انتقال اسی سن میں ہوا۔ ان کے شاگرد ہدایت اللہ نے ان کی وفات کی تاریخ اس مصرع سے نکالی۔

ع حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب

خواجہ میر درد کا مزار ترکمان دروازے کے سامنے سڑک پار کر کے اس میدان کے پاس ہے جہاں ذاکر حسین کالج کی عمارت کے لیے زمین دی گئی ہے۔ وہیں ان کے والد کا بھی مزار ہے۔

تصانیف

درد ایک اونچے درجہ کے شاعر ہونے کے ساتھ ایک بلند پایہ عالم بھی تھے چنانچہ ان کے اردو اور فارسی دیوان کے علاوہ بھی انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ یہ سب کتابیں مذہب کے موضوع سے متعلق ہیں اور لوگوں کی ہدایت اور بھلائی ان کا مقصد ہے۔ ان کتابوں کا مختصراً تعارف یہ ہے۔

کتاب الصلوٰۃ

یہ مختصر رسالہ نماز کی اہمیت اور اس کے طریقے کے بارے میں ہے۔ اس میں انھوں نے نماز کا صحیح طریقہ بتایا ہے۔ جس وقت درد نے اس کو لکھا ہے اس وقت ان کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مذہب سے دلچسپی اور واقفیت شروع ہی سے تھی۔

واردات

واردات کے معنی ہیں واقعہ اور حالات۔ اس کتاب میں فارسی کی رباعیاں[1] ہیں۔ یہ تمام رباعیاں عشقِ الٰہی یعنی اللہ کی محبت کے جذبے میں ڈوبی ہوئی ہیں اور چونکہ یہ درد کے دل کے سچے جذبات ہیں اور ان میں بناوٹ یا مبالغہ نام کو بھی نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے ان رباعیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ جب دل پر محبتِ الٰہی کا جذبہ شدت سے طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ زبان پر یہ رباعیاں آجاتی ہیں۔ رباعیوں کے درمیان کہیں کہیں ان کی وضاحت بھی موجود ہے۔

علم الکتاب

اس کتاب میں انھوں نے واردات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے جو عشقِ الٰہی

---

[1] رباعی ۔ چار مصرعے جو اوزانِ مخصوص پر ہوں

میں ان پر گذرتی ہے گویا یہ واردات ہی کی شرح اور تفصیل ہے۔

نالۂ درد اور آہ سرد

یہ دو الگ الگ کتابچے ہیں۔ کبھی کبھی جب درد پر حیرت اور محویت کا عالم طاری ہوتا تھا اس وقت ان کے منہ سے جو باتیں نکلتی تھیں ان کے چھوٹے بھائی میر اثر ان کو لکھتے جاتے تھے۔ بعد میں ان کو یکجا کر دیا گیا۔

شمع محفل اور دردِ دل

یہ دونوں رسالے بھی تصوّف کے موضوع سے متعلق ہیں۔ ان دونوں میں انھوں نے اپنے صوفیانہ خیالات اور احساسات کو نظم کے انداز میں ظاہر کیا ہے۔ کہیں کہیں نثر کی عبارت بھی ہے۔

حرمت غنا

اس میں درد نے غنا یعنی موسیقی کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ کن صورتوں میں بالکل منع ہے اور کن شرطوں کے ساتھ جائز ہے۔

واقعات دردِ دل اور سوزِ دل

یہ دونوں رسالے بھی تصوّف اور اس کے مختلف مقامات کے بارے میں ہیں۔ جن کو درد نے بڑی وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔

شاگرد

پہلے زمانے میں اچھے شاعروں کی پہچان یہ ہوتی تھی کہ ان کے شاگردوں کی تعداد کیا ہے۔ یہ شاگرد صرف اپنی شاعری پر ہی اصلاح نہیں لیتے تھے بلکہ استاد ان کی ادبی شخصیت کی تربیت بھی کرتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مشاعروں میں دو استاد موجود ہیں اور ان کے شاگرد بھی شریک ہیں۔ ہر شاگرد کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے استاد کا نام اونچا ہو۔ اس لیے دوسرے استاد اور ان کے شاگردوں پر فقرے کستے اور جب وہ کلام پڑھتے تو اعتراض کرتے تھے۔ یہ سب کچھ کبھی شاگرد خود کرتے اور کبھی استادوں کے اشارے پر ایسا ہوتا۔ اس سلسلہ میں انشاء اور مصحفی کا قصہ بہت مشہور

ہے کہ مصحفی کے شاگردوں نے کسی مشاعرے میں انشاء اور ان کے شاگردوں پر فقرے چست کیے اور ہجویہ[1] اشعار پڑھے۔ اس کے جواب میں اگلے دن انشاء کے اشارے پر ان کے شاگردوں نے ایک جلوس نکالا۔ اس جلوس کے آگے ایک گڈا گڑیا بنایا اور دونوں کو لڑاتے ہوئے یہ پڑھتے ہوئے نکلے۔ ع لڑتے ہوئے آتے ہیں مصحفی اور مصحفن۔ قریب تھا کہ دونوں گروہوں میں لڑائی ہو جاتی کہ کوتوال شہر نے آکر مجمع کو منتشر کر دیا مگر درد ان دنگلوں کے شاعر نہ تھے وہ دوسرے ہی قسم کے شاعر تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کی برائی سے اپنی زبان کو گندہ نہیں کیا کسی شاعر کے مقابلے پر آنے یا کسی دربار میں جگہ پانے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ ہمیشہ دنیاوی شہرت سے دور بھاگے۔ اس لیے ان کے شاگردوں کی تعداد بھی اتنی زیادہ نہیں جتنی ان کے زمانے کے دوسرے استادوں مثلاً میر یا سودا کے شاگردوں کی تعداد تھی۔ پھر بھی اس زمانے کے کئی شاعر ان کے شاگرد تھے اور اپنے کلام پر ان سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے خاص شاگردوں میں ان کے چھوٹے بھائی خواجہ میر اثر تھے۔ جن کی مثنوی "خواب و خیال" اردو میں بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ قائم چاندپوری۔ میر محمدی بیدار اور ثناء اللہ خاں فراق کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے عزیز شاگردوں میں کتنے ہی لوگ ایسے تھے جن کا تعلق اسلام سے نہیں بلکہ ہندو مذہب سے تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ درد واقعی وسیع الخیال اور درویش انسان تھے۔ جن کی نگاہ میں تمام انسان برابر تھے۔ وہ اپنے مذہب کے پابند ہوتے ہوئے بھی دوسرے مذہب والوں سے نفرت یا بے گانگی نہیں برتتے تھے۔ بلکہ ان کی محفل میں ہر شخص بے تکلفی سے شریک ہو سکتا تھا۔ ان کی زندگی سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ مذہب نفرت کرنا نہیں سکھاتا۔ بلکہ آدمی کو انسان بناتا ہے۔

---

[1] ہجویہ اشعار: وہ اشعار جن میں کسی کی برائی ہو۔

تصوّف کیا ہے؟

تصوّف کا موضوع ایسا مشکل ہے کہ اس کو پوری طرح سمجھانے کے لیے بہت وقت اور علمیت درکار ہے اور سمجھنے کے لیے بھی بہت معلومات کی ضرورت ہے۔

تصوّف کے معنی سمجھنے کے لیے بات اس طرح سمجھو کہ انسان میں سوچنے اور غور و فکر کا جو مادہ ہوتا ہے وہی اس کو دوسرے تمام جانداروں سے بہتر اور بڑا بناتا ہے وہ اپنی معلومات کو بڑھانے کی فکر میں رہتا ہے اور ان معلومات سے فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی کو بہتر بناتا ہے۔ قاعدہ اور قانون بناتا ہے تاکہ دنیا میں زیادہ سکون اور اطمینان سے رہ سکے۔ اس نے جن چیزوں کا علم حاصل کیا وہ زیادہ تر اسی دنیا کی چیزیں تھیں۔ جنھیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا، کانوں سے سنتا تھا۔ چھو کر اس کو محسوس کرتا تھا۔ جیسے اس نے جانوروں کا علم حاصل کیا، پیڑ پودوں کا علم حاصل کیا۔ پتھروں اور چٹانوں کا علم حاصل کیا۔ سورج، چاند اور ستاروں کا علم حاصل کیا۔ یہ علم جو اس نے اس دنیا کے بارے میں حاصل کیا سائنس کہلایا۔ اس کی کتنی ہی شاخیں پیدا ہو گئیں۔ مگر آدمی اس مادّی علم سے مطمئن نہیں ہو سکتا تھا اس کی روح یا عقل اسے ان چیزوں کے متعلق سوچنے اور معلومات حاصل کرنے پر بھی اکساتی تھی جو اس دنیا سے الگ اور اوجھل تھیں وہ سوچنے لگا کہ اس دنیا کو کس نے بنایا؟ وہ خود کیسا ہے؟ دنیا کو پیدا کرنے کا مقصد کیا ہے؟ خود انسان کا اس دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ اس دنیا میں آنے سے پہلے وہ کہاں تھا اور مرنے کے بعد وہ کہاں جائے گا؟ ان سوالات کا جواب پانے کے لیے اس نے مذہب کا سہارا لیا۔ مذہب نے کچھ سوالوں کا جواب تو دیا مگر بہت سے سوال اب بھی بغیر جواب کے رہ گئے تھے۔ وہ ان کے بارے میں سوچتا ہی رہا۔ ان سوالات سے متعلق خیالات ہی تصوّف کی بنیاد بنے۔ انگریزی میں تصوّف کے لیے MYSTICISM کا لفظ استعمال ہوتا ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ ان چیزوں کا علم جو چھپی ہوئی ہیں اور اس دنیا سے مختلف اور الگ ہیں۔ چنانچہ ہر زمانے میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جھوں نے اپنی

ساری زندگی ان باتوں کے پتہ لگانے میں گذار دی ۔ ہندی میں ان لوگوں کو بھگت کہا گیا ۔ فارسی اور اردو میں صوفی، انگریزی میں SAINT یہ لوگ الگ الگ مذہب کے ماننے کے باوجود اپنے مذہب کی تعلیمات کے اندر رہ کر زندگی کی سچائیوں تک پہنچنے کی برابر کوشش کرتے رہے ۔ ان کے خیالات میں کسی قدر فرق ضرور نظر آتا ہے ۔ مگر منزل پر پہنچنے کی تمنا سب کی ایک ہے ۔ کچھ باتیں ایسی تھیں جن کو سب نے سچّا مانا ۔ ان لوگوں نے کہا کہ سب کا مالک اور اصلی ذات صرف ایک ہی ہے ۔ وہ ذات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی ۔ سب انسان اور یہ دنیا اس کے نور کا عکس ہیں اس سے الگ رہ کر کوئی چیز حقیقت نہیں رکھتی ۔ انسان چونکہ مادّہ کا بنا ہوا ہے اس لیے مٹ جائے گا مگر روح ختم نہیں ہوگی چونکہ وہ خدا کا ایک حصّہ ہے ۔ اس دنیا میں ہم تھوڑے عرصہ کے لیے مہمان کی حیثیت سے آتے ہیں ۔ یہ ہمارا گھر نہیں بلکہ سرائے یا مسافر خانہ ہے یہاں کچھ عرصہ رہ کر ہمیں واپس لوٹ کر جانا ہے ۔ اگر ہم نے یہاں اپنا دل لگایا یا غلط باتوں میں پھنس کر اپنے اصلی گھر کو بھول گئے تو ہم برباد ہو جائیں گے اسی کے ساتھ صوفیوں نے اس پر بھی زور دیا کہ جب سارے انسانوں کی اصل ایک ہے تو کسی سے نفرت کرنا، دشمنی رکھنا، کسی کو حقیر سمجھنا یا جھگڑا کرنا بہت بڑی غلطی ہے ۔ تصوّف نے انسان سے محبّت اور برابری کا سبق دیا ہے اور تمام اختلافات اور جھگڑوں کو مٹانے کی نصیحت کی ہے ۔ اسی کے ساتھ دنیا کی محبت اور دنیا کے ساز و سامان کی خواہش سے بھی روکا کیوں کہ یہ چیزیں ہماری راہ میں پتھر تھیں اور یہ ہم کو خدا تک پہنچنے سے روک دیتے ہیں ۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ تصوّف ایک فلسفہ بھی ہے اور ایک اخلاقی قانون بھی ۔ اس سے ہمارے خیالات میں وسعت اور بلندی بھی پیدا ہوتی ہے اور ہمارے اخلاق بھی سدھرتے ہیں اور ایسے کاموں پر پابندیاں لگ جاتی ہیں جن کو کرنے سے انسان کا نقصان ہے ۔

ہمارے یہاں ہندوستان میں صوفیوں اور بھگتوں کا سلسلہ بہت پرانے زمانے سے چلا آرہا ہے ۔ ان لوگوں نے یہاں امن اور محبّت پھیلانے میں بڑا کام کیا ہے ۔ ان لوگوں نے یہاں آپس کے اختلافات کو ختم کر کے بھائی چارہ کی فضا پیدا کی ۔ نفرتوں کو دور کیا اور محبت کو عام کیا ۔ دنیاوی طاقتوں کی پرواہ نہ کر کے صرف

خدا سے ڈرنا سکھایا ۔ خود غرضی اور مطلب پرستی کی بجائے قربانی اور ایثار کی زندگی گذارنے پر زور دیا اور خدا سے لو لگانے کی نصیحت کی ۔ دنیا کی مصیبتوں اور تکلیف پر صبر کرنا سکھایا جو کچھ ملے اس پر قناعت کرنے کا سبق سنایا ۔

ویسے تو یہ خیالات ہر زمانہ کے لیے اچھّے اور قابلِ قبول تھے مگر اس زمانے میں جب کہ چاروں طرف افراتفری مچی تھی ۔ لوٹ مار ۔ قتل و غارت گری اور ہنگامہ برپا تھا ۔ نہ محلوں میں سکون اور نہ جھونپڑوں میں ۔ ہر ذہن پریشان اور ہر دل خوف زدہ اور غمگین تھا ۔ اس وقت ان خیالات نے لوگوں کو بڑا سہارا دیا ۔ اگر ان کو سکون نظر آیا تو ان خیالات کے سایہ میں ۔ ویسے بھی جب دنیا کے سہارے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو آدمی خدا ہی کا سہارا تلاش کرتا ہے ۔

ع جب دیے رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

چنانچہ اس دور میں اکثر لوگ اور زیادہ تر شاعر تصوّف کی طرف مائل ہو گئے تھے ۔ وہ لوگ حالات کی پریشانیوں کو اپنی تقدیر کا لکھا اور خدا کا حکم کہہ کر قبول کر لیتے تھے ۔ اس طرح تصوّف کے خیالات نے ان شاعروں کی زندگی کو ناکامی اور محرومی کے اثرات سے بچائے رکھا اور اسی کے ساتھ تصوّف کی وجہ سے اردو شاعری بھی بہت سی خرابیوں سے محفوظ رہی اور اس کا اخلاقی معیار بلند ہو گیا ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تصوّف بے عملی کی تعلیم دیتا ہے اور دنیا کے چھوڑ دینے پر زور دیتا ہے بلکہ بہت سے ایسے لوگ جو درویش اور صوفی نہیں تھے ۔ مگر درویشوں کا لباس پہن کر خود کو بھی درویش کہنے لگے ۔ اس وجہ سے بہت سے لوگ بدگمان ہو گئے کہ شاید تصوّف ہی میں کچھ خرابی ہے ۔ تم نے شاید وہ قصّہ تو سنا ہوگا کہ ایک مرتبہ ایک درویش بادشاہ کے یہاں مہمان تھا ۔ جب وہ درویش کھانے کے لیے بیٹھا تو اپنی بھوک سے کم اور جب نماز کا وقت آیا تو اس سے زیادہ نماز پڑھی جتنا کہ روز پڑھتا تھا تا کہ لوگ اس کے بارے میں اچھّی رائے قائم کریں ۔ جب وہ درویش اپنے مکان پر واپس آیا تو کھانا طلب کیا ۔ اس کے بیٹے نے دریافت کیا کہ ”ابا جان ! آپ نے بادشاہ کی محفل میں کھانا کیوں نہیں کھایا ؟“ درویش نے جواب دیا کہ اس کے سامنے اس لیے نہیں کھایا کہ یہ بات دنیا میں میرے کام آئے ۔

بیٹے نے کہا کہ "آپ نماز بھی دوبارہ پڑھ لیجیے تاکہ دوسری دنیا میں یہ کام آئے۔" لیکن ہمارا مقصد ایسے لوگوں کی تائید کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ہماری مراد ایسے صوفیوں سے ہے۔ جن کے عمل نے اور تعلیم نے سوسائٹی کی برائیوں کو دور کیا ہے۔ اخلاق کا معیار بلند کیا۔ بھائی چارہ اور محبت کا جھنڈا بلند کیا۔ خواجہ میر درد کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے قول اور عمل سے کس طرح انسان کو نیکیوں کا سبق دیا ہے۔

درد کی شاعرانہ خصوصیات

درد کے زمانہ اور ماحول کے بارے میں ان کے خاندان اور مزاج کے متعلق بھی گذشتہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آچکا ہے۔ اب ہم ان کی شاعری کی خصوصیات بھی بتائیں گے اور مثالوں سے ان کی وضاحت کریں گے۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ آدمی اپنی تحریروں سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی بات کو انگریزی میں کسی نے اس طرح ادا کیا ہے۔ STYLL IS THE NAN ویسے تو دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جن کے قول اور عمل میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے جو باتیں بہت اونچی کرتے ہیں مگر زندگی میں ان باتوں میں سے کسی پر عمل نہیں کرتے۔ جن کی شاعری اور تصنیفات پڑھ کر ہم ان کی جو تصویر اپنے دماغ میں بناتے ہیں وہ اس سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بات میں زیادہ اثر نہیں ہوتا اور ان کی شہرت وقتی ہوتی ہے۔ کچھ زمانہ گذرنے پر ان کی حقیقت کھل جاتی ہے اور کسی پر ان کا اثر نہیں ہیں لیکن جو بڑے شاعر یا ادیب ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی اور شاعری میں یہ فرق نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی تحریروں کے آئینے میں ہم ان کی زندگی کی سچّی اور مکمّل تصویر دیکھ سکتے ان کی باتوں میں کوئی دکھاوا، نقالی یا بناوٹ نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ جیسا سوچتے اور محسوس کرتے ہیں اسی کا اظہار شاعری میں بھی کرتے ہیں اور جب شاعری کی زبان میں سچّائی اور خلوص پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا کلام امر اور انمٹ ہو جاتا ہے۔ ایسی شاعری کو ہر دور اور ہر زمانہ میں مانا جاتا ہے چاہے کوئی ان باتوں سے اتفاق نہ رکھتا ہو پھر بھی اس کی بڑائی کا اقرار ضرور کرتا ہے۔

جس سچّے شاعر کا ذکر اوپر آیا اسی قسم کے شاعر خواجہ میر درد بھی تھے۔ انھوں نے جیسی زندگی گذاری، جن چیزوں پر ان کا ایمان اور یقین تھا وہی خیالات ہمیں ان کی شاعری میں بھی ملتے ہیں۔ ان کی زندگی اور شاعری میں کوئی فرق نظر نہیں آتا یہی سبب ہے کہ آج ان کا درجہ اردو شاعری میں بہت اونچا مانا جاتا ہے اور انھیں اردو شاعری کی عمارت کے چار ستونوں میں سے ایک ستون کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جنھوں نے شاعری کو ترقی دی اس کو بہت سی خامیوں اور برائیوں سے پاک

کیا اور اس کے اصول اور قاعدے مقرّر کیے۔ تم جاننا چاہو گے کہ باقی تین ستون کون تھے تو سنو وہ ستون تھے مرزا مظہر جانِ جاناں، مرزا محمد رفیع سودا اور میر تقی میر۔ ان لوگوں سے پہلے اردو شاعری کا دامن بہت تنگ تھا۔ اس میں صرف غزلیں لکھی جاتی تھیں اور غزلوں میں بھی سطحی اور پست خیالات ہوتے۔ زبان بھی بہت ٹوٹی پھوٹی اور ناہموار تھی۔ بات کو گھما پھرا کر بیان کرنے کو استادی سمجھا جاتا تھا۔ الفاظ کے الٹ پھیر کو کمالِ شاعری خیال کیا جاتا تھا۔ غرض یہ کہ خیال اور اندازِ بیان دونوں کے اعتبار سے شاعری بہت محدود تھی۔ ان چاروں استادوں نے شاعری کی ان خامیوں کو دور کیا۔ اس کے اصول اور قاعدے مقرّر کیے۔ بات کو ادا کرنے کے لیے سادہ اور براہِ راست انداز اختیار کیا۔ خیالات میں وسعت پیدا کی اور عشقیہ خیالات کے علاوہ شاعری کی دوسری قسمیں جو عربی یا فارسی شاعری میں رائج تھیں ان کو اردو میں بھی رائج کیا۔ جیسے مرثیہ، قصیدہ، مثنوی وغیرہ۔ اس طرح شاعری میں وسعت پیدا ہوئی اور جو اردو میں شاعری کرنا اپنے لیے باعثِ شرم خیال کرتے تھے۔ اب فارسی کو چھوڑ کر اردو میں شعر کہنے لگے۔ اسی لیے ان کو اردو شاعری کے چار ستون کہا جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سی خصوصیات تھیں جن کی بنا پر درد کی شاعری کو عوام اور خواص میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اگرچہ ان کا دیوان بہت مختصر ہے پھر بھی یہ دوسرے شاعروں کے موٹے اور بڑے دیوانوں پر کیوں بھاری ہے۔ ان کی شاعری کو ذیل کی خصوصیات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

سادگی اور شیرینی

درد کے دیوان پر نظر ڈالتے ہی سب سے پہلے جس خصوصیت کا اندازہ ہوتا ہے ان کا سیدھا سادہ اندازِ بیان ہے۔ جس طرح ان کی زندگی سادہ تھی۔ اسی طرح ان کی شاعری میں بھی کسی قسم کی بناوٹ یا تکلّف نہیں پایا جاتا۔ خواہ وہ عشقیہ خیالات ہوں یا اخلاق اور تصوّف کے مضامین۔ وہ انھیں ایسے آسان اور سادہ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ہر ایک کی سمجھ میں بخوبی آجائے۔ ویسے تو دہلی کے شاعروں کی خصوصیت ہی سادگی کہی جاتی ہے۔ یہاں کے لوگوں نے عموماً رنگینی اور بات کو بڑھا چڑھا کر اور معمّہ بنا کر پیش کرنے سے پرہیز کیا ہے۔ لیکن سادگی میں درد کا مقابلہ

کوئی شاعر نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ میر تقی میر جن کو خدائے سخن کہا جاتا ہے ان کے یہاں بھی ہمیں ایسی گھلاوٹ اور صفائی نہیں ہے اور کہیں کہیں ان کے اشعار میں ایسے الفاظ بھی مل جاتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ زبان سے مشکل سے ادا ہوتے ہیں بلکہ جو سننے میں بھی کانوں کو بھلے نہیں لگتے۔ میر کی شاعری کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے اچھے اشعار تو بہت اعلیٰ ہیں لیکن پست اشعار بہت پست ہیں۔ مگر درد کی شاعری میں یہ عیب بالکل نہیں ملے گا۔ شروع سے آخر تک ایک ہی طرح کی سیدھی سادی اور دل میں اتر جانے والی شاعری ہے۔ کہیں الفاظ میں جھول یا اونچ نیچ نہیں پائی جاتی۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ درد نے شاعری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا تھا کہ اپنے دیوان میں اضافہ کرنے کے لیے بلاضرورت شعر کہیں۔ وہ شعر اسی وقت کہتے تھے جب ان کے پاس کہنے کے لیے کوئی بات ہوتی تھی۔ اس لیے ان کے یہاں بھرتی کے اشعار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کا دیوان مختصر تو ہے مگر بہترین انتخاب ہے۔ ان کے یہاں سادگی ان کے درویشانہ اور فقیرانہ مزاج کے سبب سے آئی ہے۔ ایک درویش اور دنیادار انسان میں یہ فرق ہوتا ہے کہ عام آدمی دوسروں کی زبان سے اپنی تعریف سننے اپنی بڑائی منوانے اور اپنے کو سب سے بڑھ کر ثابت کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ مگر ایک درویش کو کسی تعریف یا برائی کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ صرف دل کا کہنا کرتا ہے اور ظاہری دکھاوے سے بے نیاز ہوتا ہے۔ درد چونکہ سچّے درویش تھے اس لیے انھیں کسی قسم کا تکلّف اور بناوٹ پسند نہ تھی یہی انداز ان کی شاعری کا بھی ہے ان کے یہ اشعار پڑھو۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا / تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں / تیرے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا / کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں میری / جی میں یہ کس کا تصوّر آگیا

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے / اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے / ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

دوستو! دیکھا تماشا یاں کا بس / تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

درد کے یہ اشعار انتہائی سادہ اور سہل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت دل کش اور

تاثیر سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں بے رنگی اور پھیکا پن نہیں ہے صرف انہیں اشعار پر موقوف نہیں ہے بلکہ ان کے زیادہ تر اشعار اسی انداز کے ہیں۔ ان اشعار کی خوبی یہ ہے کہ ان میں نہ تو کسی قسم کی بناوٹ ہے اور نہ سجاوٹ۔ نہ اونچے الفاظ ہیں اور نہ نئی ترکیبیں۔ مگر کہنے کا انداز ایسا انوکھا اور پُر اثر، سچائی اور خلوص سے بھرا ہوا ہے۔ کہ بے ساختہ واہ منہ سے نکل جاتی ہے۔ ایسے ہی اشعار کو اردو فارسی کی اصطلاح میں سہل ممتنع کہا گیا ہے۔ یعنی شعر بظاہر ایسا سادہ معلوم ہو کہ سننے والا سوچے کہ اس میں کیا خاص بات ہے یہ تو ہر ایک کہہ سکتا ہے مگر جب اس جیسا شعر کہنے بیٹھے تو بڑے سے بڑا استاد بھی نہ کہہ سکے۔ ان کی سادگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے بعض اوقات ایسے مشکل اور پیچیدہ مسائل کو اپنے اشعار میں پیش کیا ہے جن کو فلسفہ اور تصوّف نے سلجھانے کی کوشش کی ہے اور جن کو سمجھنا اور سمجھانا عام آدمی کے لیے آسان نہیں۔ مگر درد نے ان کو بھی بڑے عام فہم اور دل میں اتر جانے والے الفاظ میں بڑی آسانی سے ادا کر دیا ہے کہ ان میں کوئی مشکل ہی نہیں رہی۔

صوفیوں کا کہنا ہے کہ اس دنیا اور اس کی چیزوں کی کوئی اصلیت نہیں۔ ان سب کے پیچھے ایک حقیقت، ایک سچائی، ایک حسن چھپا ہوا ہے۔ ہم چیزوں کو الگ الگ خیال کرتے ہیں اور ان کو جدا جدا نام دے رکھے ہیں۔ یہ ہماری بھول ہے۔ چاند سورج، ستارے، دریا، پہاڑ، پھول، انسان یہ سب الگ کوئی چیزیں نہیں۔ سب کے پردہ میں ایک ہی ذات (خدا کی ذات) چھپی ہوئی ہے۔ اگر ہم اس کو دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف ایک طریقہ ہے کہ اس کی محبت میں اپنے کو اس طرح ڈبو دیں اور محبت کی منزل تک پہنچ جائیں تو پھر یہ سارے پردے خود بخود چاک ہو جائیں گے اور ہم اس کو دیکھ سکیں گے۔ کوئی اور چیز ہمیں موجود نظر نہیں آئے گی۔ دیکھو اتنی مشکل اور لمبی بات کو درد نے کس مزے سے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینے کے سامنے جب آ کے ہُو کریں

اس بات پر تو سارے مذہب والے متفق ہیں کہ خدا تک پہنچنے کے لیے یا اس کو

سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آدمی اپنے دل کو تمام برائیوں سے پاک کر لے۔ ہر طرح کی نفرت اور کھوٹ کو دل سے دور کرے کیونکہ جس طرح دھندلے آئینے میں صورت نظر نہیں آتی اسی طرح وہ دل جو برائیوں کی دھول میں اٹا ہوا ہے اس میں خدا کا نور نہیں آ سکتا۔ اس بات کو درد نے اپنے اشعار میں بڑے سادہ اور خوبصورت انداز میں بار بار دہرایا ہے۔

اے درد کر تک آئینہ دل کو صاف تو
پھر ہر طرف نظارۂ حسن و جمال کر

حجاب[1] رخ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب، کوئی پردا نہ دیکھا

درد و غم

دلّی کی بربادی کی داستان سے ظاہر ہے کہ اردو شاعری کی ترقی اور مقبولیت کا زمانہ وہی تھا جو مغل حکومت کی تباہی اور بربادی کا زمانہ تھا۔ ان حالات کا اثر سب پر پڑ رہا تھا۔ خواہ وہ حاکم ہو یا محکوم[2]، ہو یا غریب، ادیب ہو یا شاعر۔ ہر شخص کے سوچنے کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ شاعروں میں بھی دو طرح کے لوگ تھے۔ کچھ لوگوں پر تو ان حالات کا یہ اثر ہوا کہ وہ اور زیادہ عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے شراب، ناچ گانے اور قہقہوں میں اس غم کو بھول جانا چاہا چنانچہ ان کی شاعری میں بھی انہی سب چیزوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ حالات کی سختیوں سے چھٹکارا پانے کی یہی صورت خیال کرتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ وقت محبت کی رنگینیوں اور خیالات کی دنیا میں گذاریں۔ دوسرے وہ لوگ تھے جنھوں نے حالات سے ہار مان لی تھی۔ ان کے یہاں مایوسی اور محرومی اور غم و ناکامی کے ذکر کے سوا کوئی دوسرا ذکر یا دوسری بات نہیں ملتی۔ ان لوگوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ حالات کو بدل سکتے اور اس کے اصلاح کی کوشش کرتے۔ اس لیے ان کی شاعری میں بھی مایوسی، غم اور رنج پیدا ہو گیا اور یہ خیالات اتنے بڑھے کہ سمجھا جانے لگا کہ دہلی کی شاعری کی لازمی خصوصیت رنج و غم ہے۔ خواجہ میر درد جو دہلی کے رہنے والے تھے......

---

[1] حجاب: پردہ   [2] محکوم: جس پر حکومت کی جائے۔ غلام

.... دہلی کی بربادی اور تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے ان کے یہاں بھی درد و غم کا ہونا ضروری تھا۔ چونکہ وہ سچے مذہبی انسان تھے۔ خدا پر ان کو بھروسہ تھا اور وہ اس کے بھی قائل تھے کہ تقدیر کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔ اس کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ اس لیے وہ حالات سے گھبرائے تو نہیں اور اسی لیے انھوں نے دہلی کو چھوڑنا پسند نہ کیا۔ مگر اس کا یہ اثر ہونا تو لازمی تھا کہ ان کے یہاں بھی غم کا وہی انداز پیدا ہو گیا جو میر تقی میر اور دہلی کے اکثر شاعروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں بھی ہمیں آنسو اور آہیں ملتی ہیں۔ مسکراہٹ اور زندہ دلی کا کہیں نام نہیں۔

ظاہر ہے جس شخص کی آنکھوں کے سامنے خون کے دریا بہہ رہے ہوں۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہو، انسان کا خون پانی سے زیادہ سستا ہو، عزت خاک میں مل رہی ہو، ہمدردی اور محبت کا کال ہو۔ اس شخص سے ہم ہنسی کی امید کیسے کر سکتے ہیں۔ کوئی بے حس اور بے درد آدمی ہی ایسے حالات میں ہنسی کی بات کر سکتا ہے۔ میر کے لیے مشہور ہے کہ ان کے کلام میں صرف "آہ" ہے مگر درد کی شاعری میں بھی ہمیں آہ و کراہ کی ہی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ان کا غم چونکہ نقلی و بناوٹی نہیں۔ اس لیے اس میں اثر بھی بہت ہے۔ ہم کس قسم کے شعر پسند کرتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے لیکن ان کے اشعار کی تاثیر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ بے بسی کا یہ حال ہے کہ دل میں طوفان برپا ہے مگر زبان پر مہر لگی ہوئی ہے کہ حالِ دل نہ بیان کروں۔

آہ کہیں یہ ناتواں حال کرے سو کیا بیاں
منہ پہ ہے مہرِ خامشی، دل میں بھرا خروش ہے

نیچے دیئے ہوئے شعر میں شاعر اپنے آپ کو شمع سے تشبیہ دے رہا ہے کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر رہتی ہیں اور ان آنسوؤں کی وجہ سے اس کا دامن بھیگا رہتا ہے۔ (موم کے پگھلنے کو آنسوؤں سے تشبیہہ دی ہے) اس میں ایک لطف یہ بھی ہے کہ 'دامن تر' کے معنی گناہ گار کے ہیں۔ اب شعر سنیئے۔

شمع کی مانند ہم اس بزم میں — چشم تر آئے تھے، دامن تر چلے

دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ غم کے ابتداء میں تو ہم نے برداشت کر لیا۔ مگر اب حالات

اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ ان کا برداشت کرنا قابو سے باہر ہے۔

اب دل کا سنبھالنا ہے مشکل — اگلے دنوں کچھ سنبھل گیا تھا

درد کے غمگین اشعار میں ایک خاص بات یہ نظر آئے گی کہ اپنی بربادی اور تباہی کا اتنا غم نہیں جتنا کہ دوسروں کے انجام کا غم ہے۔ وہ اپنی حالت پر قانع ہیں اور اپنی گدڑی میں مست ہیں لیکن جو زمانہ کا یہ انقلاب دیکھتے ہیں کہ بادشاہ دربدر بھیک مانگ رہے ہیں۔ آبادیاں ویران ہو رہی ہیں۔ بہار خزاں میں تبدیل ہو رہی ہے تو ان کا حساس دل غم سے بھر جاتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں۔

چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم
بہار باغ تو یوں ہی رہی لیکن کدھر شبنم

شبنم روتی ہوئی گئی ہے اور کہہ رہی ہے کہ باغ تو موجود ہے مگر جن لوگوں سے باغ کی رونق تھی وہ دنیا سے چلے گئے۔

نہ پایا جو گیا اس باغ سے ہرگز سراغ اس کا
نہ پلٹی پھر صبا ایدھر، نہ آئی پھر نظر شبنم

اس باغ کا معاملہ عجیب ہے کہ جو یہاں سے جاتا ہے پھر لوٹ کر واپس نہیں آتا۔ صبا ادھر سے گئی اور پھر واپس نہیں آئی، شبنم نے چند لمحات کے لیے اپنے آپ کو دکھایا اور معلوم نہیں کہ کہاں اڑ گئی۔ مراد یہ ہے کہ جو دنیا سے جاتا ہے وہ پھر واپس نہیں آتا۔

جلتا ہے اب پڑا خس و خاشاک میں ملا
وہ گل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا

دنیا کا حال یہ ہے وہ لوگ جو عزت والے تھے اور ان کی شان و شوکت تھی، زمانہ کے اس انقلاب کو اس نے خاک میں ملا دیا۔ ایسے لوگوں کی مثال پھول سے دیتے ہیں کہ وہ پھول جو چمن کی رونق کا سبب تھا اب دیکھا تو خاک میں پڑا ہوا برباد ہو رہا تھا۔

انسان کی فطرت ہے کہ جب اس کا اپنا دل خوش اور مطمئن ہوتا ہے تو اس کو ہر چیز مسکراتی نظر آتی ہے لیکن جب وہ غمگین اور افسردہ اور اداس

ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز اداس اور غم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ چنانچہ پھول کا کھلنا خوشی کی علامت ہے اور اس کو پھول کے کھلنے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مگر درد کو وہ منظر غم میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ اس کے کھلنے کو وہ کپڑوں کے چاک ہو جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ پھول بھی کسی کے ماتم میں اپنا لباس چاک کر رہے ہیں اور شبنم رو رہی ہے۔

ہمیں تو باغ تجھ بن خانۂ ماتم نظر آیا
ادھر گل پھاڑتے تھے جیب روتی تھی ادھر شبنم

یہی نہیں بلکہ ان کا عید کا دن بھی اداس نظر آتا ہے اور پیالے میں بھری شراب سرخ خون دکھائی دیتی ہے۔

سحر گہ عید میں دور سبو[1] تھا — پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

دو شعر اور سنئے:

کچھ دل ہی باغ میں نہیں تنہا شکستہ[2] دل
ہر غنچہ دیکھتا ہوں تو ہے گا شکستہ دل
شادی[3] کی اور غم کی ہے دنیا میں ایک شکل
گل کو شگفتہ[4] دل کہو تم یا شکستہ دل

درد کی شخصیت اور شاعری کی بڑائی یہ نہیں ہے کہ انھوں نے خوشی کے پردہ میں چھپے ہوئے غم کو دیکھ لیا ہے اور اس کے غم دل پر اٹھائے ہیں۔ ان کی بڑائی یہ ہے کہ ہر طرف غموں کی فراوانی دیکھ کر بھی وہ مایوسی یا تلخی کے شکار نہیں ہوتے بلکہ اس کو زندگی کی ایک حقیقت سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ وہ زندگی کی مشکلوں اور پریشانیوں کے باوجود اس سے پیار کرتے ہیں اور عزیز رکھتے ہیں۔ زندگی میں اگرچہ خوشیاں بہت کم بھی ہیں اور مختصر وقت کے لیے ملتی ہیں۔ مگر درد اس کو غنیمت خیال کرتے ہیں۔

---

[1] سبو: صراحی　[2] شکستہ دل: ٹوٹا ہوا دل
[3] شادی۔ خوشی　[4] شگفتہ: کھلا ہوا۔ خوش

فرصت زندگی بہت کم ہے — مغتنم[1] ہے یہ دید جو دم ہے
یہ وادید[2] جو ہو جائے غنیمت سمجھو — جوں شرر ورنہ ہم اے اہل نظر جاتے ہیں
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بھی چل سکے ساغر چلے
غافل جہاں کی دید کو مفت نظر سمجھ — پھر دیکھنا نہیں ہے عالم کو خواب میں

عشق و محبّت

غزل کے معنی عورتوں سے بات کرنے کے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں عشق و محبت کے موضوع پر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرنا۔ اس طرح گویا غزل کا لازمی موضوع محبت ہی ہے۔ فارسی اور اردو شاعری میں اس کو انہی خیالات کے لیے مخصوص سمجھا گیا اور اگر ان سے ہٹ کر کوئی بات غزل میں بیان کی بھی گئی تو اس کے لیے الفاظ اور تشبیہات اور اشارے وہی استعمال کیے گئے جو عشقیہ خیالات کے اظہار کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ جیسے شمع، پروانہ، گل اور بلبل، آشیانہ، صیاد وغیرہ۔ محبوب کا حسن، اس کی اداؤں کا ذکر، اس کی بے وفائی کا رونا، اپنی وفا کا ذکر، محبوب کی یاد، اس کی دوری سے بیقراری یہی غزل کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ لیکن محبّت کے موضوع کے اندر ہی ایک دوسرا خیال بھی غزل کے ہر دور میں نمایاں رہا۔ وہ تھا عشق حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ سے محبّت کا اظہار۔ چونکہ ہمارے اکثر شاعر صوفی مزاج اور اللہ کی محبّت میں ڈوبے ہوتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی غزل کا مخاطب اللہ کو بنایا۔ اس کے بعد بعض دوسرے شاعروں نے ان کی تقلید[3] میں ایسے شعر پڑھے جن میں خدا کو اپنا محبوب مان کر اس سے اظہار محبّت کیا جاتا تھا۔ اس لیے یہ طریقہ (عشق حقیقی) بھی غزل کے بنیادی خیالات میں داخل کر لیا گیا اور اب غزل کے دو خاص موضوع بن گئے۔ عشقِ مجازی[4] اور عشقِ حقیقی[5]۔ درد کی

---

[1] مغتنم: غنیمت　[2] وادید: دیکھنا　[3] تقلید: پیروی کرنا
[4] عشق مجازی: غیر حقیقی سے محبت　[5] عشق حقیقی: اللہ کی محبت

شاعری میں یہ دونوں موضوعات نظر آتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک سچے صوفی
خدا کے عاشق اور پرستار تھے۔ ان کی تمام زندگی عشق الٰہی میں ڈوبی ہوئی نظر
آتی ہے۔ انھوں نے یہ موضوع رسمی طور پر یا کسی کی تقلید میں نہیں اپنایا بلکہ
ان کے دل میں حقیقتاً خدا کی محبت کا شعلہ روشن تھا۔ یہ ان کے دلی جذبات
ہیں جن میں ذرا بھی بناوٹ یا دکھاوا نہیں۔ اس لیے ان کے اشعار میں بڑا اثر
ہے۔ ذیل کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

عشقِ حقیقی

اللہ کا حسن آنکھوں سے اوجھل ہے۔ وہ اتنا دور ہے کہ اس تک پیغام بھیجنا
بھی ممکن نہیں اور نہ کوئی اس کی خبر عاشق کو دے سکتا ہے۔ ہاں! اگر کوئی اس
کی خبر لا سکتا ہے تو وہ عاشق کا دل ہے۔ اسی بات کو کتنی خوبصورتی سے ادا کیا ہے

قاصد نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے — اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

اللہ کی ذات اتنی بڑی ہے کہ زمین و آسمان یا دنیا کی چیزیں ان جلوؤں کو اپنے
اندر نہیں سمیٹ سکتی اور ان میں نہ اتنی ہمت ہے کہ اس محبت کے بوجھ کو
اٹھا سکے۔ یہ انسان کی ہمت اور اس کے دل کا پھیلاؤ ہے اس کے اندر خدا کے
جلوے سما بھی جاتے ہیں اور وہ اس کی محبت کا بوجھ اٹھا لیتا ہے۔

ارض و سما[1] کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

اس شعر میں قرآن کا وہ حوالہ بھی ملتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میرے بندوں
سے کہہ دو کہ میں ان کی شہ رگ[2] سے قریب ہوں۔ یعنی جو خدا کے فرماں بردار اور
محبت کرنے والے بندے ہیں۔ خدا ان کے دل میں رہتا ہے۔

اللہ کے نیک بندے جو اس کی محبت میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ان کو دنیا کی
ہر چیز میں خدا کا ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کو اپنی ذات میں بھی اسی کا

[1] ارض و سما : زمین اور آسمان [2] شہ رگ : گلے کی وہ رگ جس پر زندگی کا انحصار ہے۔

جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ درد کہتے ہیں۔

اے درد جہاں کہیں میں دیکھا — وہ یار ہی میرا جلوہ گر تھا

انسان کا علم اور تجربہ چاہے کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ اگر وہ اپنے مالک اور
محبوب سے دور ہے اور اس کے جلوے کو نہیں دیکھ سکتا تو اس کی زندگی بیکار
ہے۔

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

جو اللہ کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور اس کے ہی حسن کا شیدائی ہوتا ہے۔
تو پھر اس کی نظر میں کوئی دوسرا نہیں سما سکتا۔

سو رنگ سے ہیں جلوہ نما گو بتانِ خلق — اپنا ترے سوا کوئی دل خواہ ہی نہیں
جھکتا نہیں ہمارا دل تو کسی جانب یاں — جی میں بھرا ہوا ہے از بس غرور تیرا

اگرچہ دنیا میں ہر طرف خدا کے جلوے موجود ہیں اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں خدا
موجود نہ ہو مگر آج تک نہ کوئی اس کو پا سکا ہے اور نہ دیکھ سکا ہے۔ درد نے کتنے سیدھے
سادے الفاظ میں اس خیال کو ادا کیا ہے۔

ڈھونڈے ہے تجھے تمام عالم — ہر چند کہ تو کہاں نہیں ہے

آنکھوں نے خدا کو کبھی نہیں دیکھا مگر دل و دماغ اسی کے خیال میں مگن رہتے ہیں۔
درد کہتے ہیں۔

میرا تو جی وہیں رہتا ہے جہاں ہے تو
اگرچہ میں یہ نہیں جانتا کہ کہاں ہے تو

درد کے نزدیک مذہب کے اختلافات کوئی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ خدا کا نور ہر جگہ
موجود ہے چاہے وہ کعبہ ہو یا بت خانہ۔ شیخ و برہمن دونوں اسی کی محبت میں
سرشار ہیں۔

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن — آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا
مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا — ہم سبھی مہمان تھے واں اک تو ہی صاحب خانہ تھا

اللہ کی محبت تنہا انسانوں ہی کے دل میں موجود نہیں ہے۔ باغ میں غنچے اس کی باتیں کرتے
ہیں اور پھول اس کی باتیں سنتے ہیں۔

کس کی صبا یہ ہوتی ہے گفت و شنید[1] باغ میں
غنچے سبھی دہاں[2] ہیں، گل بھی تمام گوش[3] ہے

اس شعر میں خوبی یہ ہے کہ پھول کو کان سے اور کلی کو منہ سے تشبیہ دی ہے۔

اللہ کا حسن دنیا کی ہر چیز میں موجود ہے۔ اس کا جلوہ ہم ہر وقت اور ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ہمارے اندر محبت کا جذبہ اور اس کو حاصل کرنے کی لگن ہونی چاہیے۔ ہماری اپنی غفلت اور گمراہی ہمیں اس سے دور کر دیتی ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیان میں پردہ بن جاتی ہے۔ ورنہ کوئی دوسرا پردہ درمیان میں نہیں ہے۔

آہ پردہ تو کوئی مانع دیدار نہیں
اپنی غفلت کے سوا کچھ در و دیوار نہیں

خدا خود ہمارے اندر موجود ہے۔ ہم اس کو نہیں دیکھ پاتے اور ادھر اُدھر تلاش کرتے ہیں یہ ہماری نادانی ہے۔

غافل تو کدھر بہکے ہے ٹک دل کی خبر لے
شیشہ جو بغل میں ہے اس میں تو پری ہے

حجاب رخ یار تھے، آپ ہی ہم	کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا
اے درد کر ٹک آئینہ دل کو صاف تو	پھر ہر طرف نظارۂ حسن و جمال کر

عشق مجازی

اب تک درد کے جو شعر مثال میں دیئے گئے ہیں وہ ایسے اشعار تھے جن میں درد اللہ کی محبت میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے دیوان میں ایسے شعر بھی کثرت سے ملتے ہیں جن میں وہ کسی انسان کی محبت میں تڑپتے اور بے قرار نظر آتے ہیں۔ ان کے اشعار کا مخاطب اس دنیا کا کوئی حسین انسان ہے۔ ان کے ایسے اشعار میں بھی بڑی سچائی اور خلوص نظر آتا ہے۔ ان اشعار سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ اشعار محض غزل لکھنے کی خاطر یا دوسروں کی تقلید میں کہے ہیں۔ بلکہ صاف یہ محسوس ہوتا ہے

[1] گفت و شنید: کہنا سننا [2] دہان: منہ [3] گوش: کان

کہ یہ کسی چوٹ کھائے ہوئے انسان کے دل کی باتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ میر درد جیسے صاف دل اور درویش مزاج آدمی سے ہم یہ امید بھی نہیں کر سکتے کہ انھوں نے یہ باتیں دکھاوے کے طور پر کہی ہوں گی۔ وہ صرف وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دل میں ہوتی ہے۔ دوسرے مصنوعی اور بناوٹی باتوں میں اتنا اثر بھی نہیں ہو سکتا جو بات دل سے نکلتی ہے وہ دل میں جاکر اترتی ہے۔ دراصل یہ سادگی اور اثر کرنے والی بات اس دور کی خصوصیت کہی جا سکتی ہے۔ اس وقت تک شاعری نے سجاوٹ، تصنع اور بناوٹ کے انداز نہیں سیکھے تھے۔ مشکل الفاظ اور فارسی ترکیبیں بھی صرف اس وقت استعمال کی جاتی تھیں جب ان کا استعمال ضروری ہوتا تھا۔ ورنہ عام طور سے سیدھے سادے اندازِ بیان کو زیادہ پسند کیا جاتا تھا اور الفاظ بھی روزانہ کی بول چال کے استعمال ہوتے تھے جن میں بے تکلف ہندی کے الفاظ بھی شامل ہوتے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب ... "آبِ حیات" میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"زبان اردو ابتدا میں کچا سونا تھی۔ ان بزرگوں نے اسے اکثر کدورتوں سے پاک کیا اور ایسا بنا دیا جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان، حسینوں کے زیور بلکہ بادشاہوں کے تاج تیار ہوتے ہیں۔ ..... یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ ان کا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ لطف زیادہ کرے گا۔ اصل کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے سودا کے کلام کے باوجود بلندیٔ مضمون اور چستیٔ بندش کے تاثیر کا طلسم ہوگا۔"

میر درد کی عشقیہ شاعری میں بھی ہمیں اس دور کی تمام نمائندہ خصوصیات نمایاں نظر آتی ہیں۔ وہ محبت میں اپنی حالت کا بیان ایسے سیدھے سادے الفاظ میں کرتے ہیں جس کی مثال ہمیں میر کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں مل سکتی۔ ان کے یہ اشعار بڑی بڑی غزلوں پر بھاری ہیں۔

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا

وہ نگاہیں جو چار ہوتی ہیں برچھیاں ہیں کہ پار ہوتی ہیں

اپنے ملنے سے منع مت کر اس میں بے اختیار ہیں ہم

پی گئی کتنوں کا لہو تیری یاد غم تیرا کتنے کلیجے کھا گیا

اس طرح جی میں سانس کھٹکے ہے سانس ہے یا کہ پھانس کھٹکے ہے

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں تیرے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

محبت نے ہم کو ثمر[1] جو دیا سو یہ ہے کہ سب کام سے کھو دیا

ان اشعار میں درد نے اپنے دل کی حالت اور محبت میں اپنی بے چینی کا ذکر اتنے سادہ الفاظ میں کیا ہے کہ جو پڑھتا ہے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ غزل کے بہترین انداز کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن جن اشعار میں انھوں نے اپنے محبوب کے حسن اور اس کی اداؤں کی تصویریں پیش کی ہیں۔ وہ بھی مصوّری اور شاعری کی بڑی دل کش مثال ہیں۔ دہلی کی شاعری میں عام طور سے محبوب کے جسمانی حسن اور اداؤں کا ذکر زیادہ تفصیل سے نہیں کیا جاتا جیسا کہ لکھنوی شعرا کے یہاں ملے گا۔ بلکہ ان کے اشعار میں اس کے حسن کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے کہ تصویر کھینچ دی جاتی ہے۔ جیسا کہ میر کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اس شعر میں میر نے نہ تو محبوب کے چہرے کا ذکر کیا ہے اور نہ آنکھوں کا اور نہ کسی جسم کے حصّے کا۔ لیکن اتنا پتا چل جاتا ہے کہ وہ اتنا حسین ہے کہ اس کے آگے چراغوں کی روشنی بھی مدھم پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح سودا کا شعر ہے۔

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس شعر میں سودا محبوب کی آنکھوں کی خوب صورتی یا نشیلے پن کے بارے میں ایک لفظ کہے بغیر اس کے حسن کو بیان کر دیتے ہیں کہ محبوب کی آنکھوں کی

[1] ثمر: پھل

یاد آتے ہی ایسا بے خود ہوا کہ اپنے پر قابو نہیں رہا اور ہاتھ سے ساغر گرنے لگا۔ میر درد کے یہاں بھی ہمیں اس طرح کے شعر ملتے ہیں۔ جن میں کوئی تفصیلی تصویر کھینچے بغیر محبوب کی دل کشی اور حسن کو بیان کر دیتے ہیں۔

رات مجلس میں تیرے حسن کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں میری
جی میں یہ کس کا[2] تصوّر آ گیا

گر باغ میں خنداں[1] وہ میرا لب شکر آوے
گل سامنے داماں سے منہ ڈھانپ کر آوے

ہم نشیں پوچھ نہ اس شوخ کی خوبی مجھ سے
کیا کہوں تجھ سے، غرض جی کو میرے بھاتا ہے

درد کے کلام کو اگر غور سے پڑھا جائے تو یہ خصوصیت بھی نظر آئے گی کہ ان میں کوئی خلافِ تہذیب یا معیارِ اخلاق سے گری ہوئی بات نہیں ملے گی۔ ان کی محبت کا معیار اونچا اور پاکیزہ ہے۔ ان چند اشعار کو چھوڑ کر جن میں اس زمانے کے مزاج سے متاثر ہو کر انھوں نے بھی کس قدر عام انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی زندگی پاکیزہ خیالات کا خزانہ ہے۔ ان کی محبت میں ضبط، احتیاط اور محبوب کی مرضی کے سامنے سر جھکا دینے کا جذبہ ہے۔ اسی لیے ان کے لہجے میں عاجزی اور انکساری ہے۔ وہ محبوب سے برابری کے انداز میں یا تیز لہجے میں بات نہیں کرتے۔ یہ خصوصیت ان کے یہاں عشقِ حقیقی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ بندہ جب خدا سے محبت کا اظہار کرتا ہے تو وہ اپنے اور محبوبِ حقیقی کے درمیان جو فرق ہے اس سے واقف ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کے لہجے میں عاجزی کا انداز رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ محبت پاکیزہ اخلاق کو بلند کرنے والی ہوتی ہے۔ اس میں کسی طرح پستی کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے

[1] خنداں: ہنستا ہوا [2] شیریں بیان، کنایۃً معشوق

ہیں کہ جو شاعر صوفی مزاج تھے اور جنھوں نے اللہ کی محبت کو اپنے دل میں بسا لیا تھا۔ ان کے عشقیہ اشعار میں بھی ایک درد، اثر، پاکیزگی اور بلندی پائی جاتی ہے۔ درد کے یہاں بھی ہمیں یہی بات نظر آتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اور اس سے مخاطب ہونے میں بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ ان کے اشعار میں اسی لیے شوخی یا بے باکی نہیں ہونے پاتی۔ مثال کے طور پر یہ شعر پڑھئے۔

مزاج نازک دل سے اگر مکدّر ہو
یہ آئینہ ہم ابھی پاش پاش کرتے ہیں

نزع میں تو ہوں ولے تیرا گلہ کرتا نہیں
جی میں ہے وہی وفا پر جی وفا کرتا نہیں

نہ ملیں گے اگر کہے گا تو
تیری خاطر ہمیں مقدّم ہے

میرے احوال پر نہ ہنس اتنا
یوں بھی اے مہربان پڑتی ہے

پروانہ کی محبت ان کے نزدیک مثالی محبت ہے۔ وہ شمع سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے اس سے دور نہیں جاتا اور آخر اس پر اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ ان کے نزدیک یہی محبت کا کمال ہے۔

ایک ہی جست میں لی منزلِ مقصود اس نے
راہرو رشک کی جا ہے سفر پروانہ

شاعر کہتا ہے کہ پروانہ کے اس سفر پر رشک آتا ہے کہ اس نے شمع کی لَو پر ایک جست لگائی اور اپنے آپ کو فنا کر دیا۔ ایسی محبت پر کون قربان نہ ہو جائے۔

شمع کے صدقے تو ہوتے ابھی دیکھا تھا اسے
پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثر پروانہ

لوگوں نے پروانہ کو شمع پر قربان ہوتے ہوئے تو دیکھا مگر اس کے بعد اس کی خاک کا نشان بھی نہ ملا۔ مراد یہ ہے کہ اس نے کس طرح اپنے وجود کو باقی نہ رکھا۔

تصویر کشی

شاعری کو مصوّری بھی کہا گیا ہے۔ یعنی جس طرح تصویر کھینچنے والا کسی منظر یا کسی خاص حالت کی تصویر بناتا ہے اسی طرح شاعر بھی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کی تصویر اپنے شعر کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصوّر کو تصویر بنانے کے

لیے رنگ، برش اور کاغذ اور دوسری چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ شاعر صرف الفاظ کے ذریعہ پیش کر دیتا ہے اور ان کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ سننے والوں کی نظر میں تصویر کھنچ جاتی ہے۔ شاعر کی بنائی ہوئی یہ تصویر مصوّر کی تصویر سے زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مصوّر صرف مادّی چیزوں کی تصویر بنا سکتا ہے لیکن انسان کے دل و دماغ میں جو جذبات اور خیالات ہوتے ہیں ان کو پورے طور پر تصویر میں ظاہر نہیں کر سکتا۔ اس لیے شاعری کو دوسرے تمام فنون سے بہتر مانا گیا ہے۔ جتنا شاعر اعلیٰ درجہ کا اور اونچا ہوگا۔ اسی قدر اس کی بنائی ہوئی تصویر اصلیت سے قریب ہوگی۔ قدیم اردو شاعری میں اگرچہ ایسی مفصّل تصویریں نہیں ملتیں جو بعض دوسری زبانوں میں نظر آتی ہیں۔ مگر انسان کے مختلف جذبوں اور حالتوں کی ہو بہو تصویریں ہمارے شاعروں نے بڑی خوبی سے پیش کی ہیں۔ درد کی شاعری میں بھی ہمیں جگہ جگہ ایسے اشعار ملتے ہیں جو کسی خاص کیفیت یا حالت کی سچّی اور پر اثر تصویریں ہیں۔ محبّت میں انسان کی کیا حالت ہوتی ہے اس کی تصویر دیکھو۔

کبھو ہنسنا، کبھو رونا، کبھو حیراں ہو رہنا
محبّت کیا بھلے چنگے کو دیوانہ بناتی ہے

محبّت کے زخموں سے شاعر کی کیا حالت ہے۔

کیا ہم کو داغوں نے سروچراغاں[1]
کبھو تو نے آکر تماشہ نہ دیکھا

شاعر کے دل میں محبت کی آگ بھری ہوتی ہے۔ وہ جب آہ کھینچتا ہے تو ہر آہ سے شعلے نکلتے ہیں اور یہ شعلے اتنے جمع ہو گئے کہ ان کا درخت بن گیا۔

ہر آہ شرر بار[2] ہے جو سروچراغاں
کیا آگ آہی میرے سینے میں بھری ہے

قاعدہ ہے کہ شبنم پر جب سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو وہ اڑ جاتی ہے۔ شاعر نے محبوب کے چہرے پر (جو سورج کی طرح حسین ہے) زلفوں سے بہہ کر پانی کی بوند

---

[1] سروچراغاں: چراغوں کا درخت۔ لوگ خوب صورتی کے لیے درخت کی شکل بنا کر اس پر چراغ جلاتے ہیں۔

[2] شرر بار: شعلے برسانے والی

جا پڑی تو حیرت سے کہتا ہے کہ سورج کی گرمی سے تو شبنم اڑ جایا کرتی ہے۔ یہ سورج (محبوب کے چہرے) پر شبنم (ز بوند) کہاں سے آ گئی ۔

عرق کی بوند اس کی زلف سے رخسار پر ٹپکی
تعجب کی ہے جا گہ یہ پڑی خورشید پر شبنم

اخلاقی مضامین

شاعری میں صرف عشق و محبت کے مضامین ہی نہیں بلکہ اس میں اخلاقی نصیحتیں بھی ہیں اور زندگی کو کس طرح بہتر بنایا جائے ۔ اس کے بارے میں ہدایتیں بھی ملتی ہیں۔ وہ کونسی چیزیں ہیں جن سے محبت کرنا چاہیے اور کن سے بچنا ضروری ہے ۔ میں بیان کیا گیا ہے کہ درد ایک صوفی بزرگ تھے ۔ ان کی زندگی کا مقصد ہی لوگوں کو راستہ بتانا تھا۔ ان کی شاعری میں بھی ان خیالات کا جا بجا اظہار ملتا ہے ۔ صرف شاعری ہی نہیں بلکہ ان کی دوسری کتابوں میں جس بات پر زور دیا گیا ہے ان کا تعلق اخلاقیات سے ہے ۔

دنیا سے بے تعلقی

سب سے پہلی بات جو درد کی شاعری میں بار بار دہرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا سے دل نہ لگاؤ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا چند روزہ ہے اور فنا ہونے والی چیزوں سے محبت کرنا بے معنی ہے ۔ اس خیال کے پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ درد کے چاروں طرف جو ماحول اور حالات تھے ۔ انھوں نے ان کے دل میں **یہ یقین پختہ کر دیا تھا** کہ دنیا بری جگہ ہے ۔ یہاں حکومت ، طاقت ، دولت اور **عزت کسی چیز کا کوئی** بھروسہ نہیں ہے ۔ آج ایک شخص تخت پر بیٹھا حکومت کر رہا ہے **کل** وہ دوسروں کا محتاج بھی ہو سکتا ہے ۔ محلوں میں رہنے والے دربدر مارے مارے بھی پھرتے ہیں ۔ جو شخص ہزاروں کی تقدیر کا مالک تھا اب دوسروں کے سامنے بے بس اور مجبور ہے ۔ درد نے اپنی آنکھوں کے سامنے حکومتوں کا تختہ الٹتے دیکھا اور قلعوں کو کھنڈر میں تبدیل ہوتے ہوتے نظارہ کیا ۔

ان کو دیکھ کر دنیا اور اس کے عیش و آرام سے نفرت پیدا ہو گئی ۔ انھوں نے خود بھی درویشی کا وہ راستہ اختیار کیا جس میں کسی چیز کے چھن جانے کا خوف ہی نہیں ہوتا اور وہ دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیتے ہیں ۔ دنیا کی ناپائداری اور زندگی کی بے حقیقتی کے بارے میں کہتے ہیں ۔

اس زیست کا اعتبار کیا ہے   کوئی دم میں یہ زندگی ہوا ہے

ایک شعر میں کہتے ہیں کہ جب دنیا میں نہ انسان باقی رہے گا اور نہ دنیا کا حسن تو پھر ہم اس دنیا میں رہنے کی خواہش بھی کیا کریں ۔

✓ نہ گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار   کس بات پر فلک ہوس رنگ و بو کریں

ایک شعر میں شبنم کے گرنے کو آنسوؤں سے تشبیہہ دیتے ہیں اور یہ آنسو اس لیے ہیں کہ دنیا تو قائم ہے جن چیزوں سے دنیا کا حسن تھا وہ رخصت ہو گئیں ۔

✓ چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم
بہارِ باغ تو یوں ہی رہے لیکن کدھر شبنم

اسی طرح ایک جگہ کہتے ہیں دنیا میں خوشی اور غم میں بھید نہیں کھلتا ۔ ایک طرف خوشیاں اور قہقہے ہیں تو دوسری طرف رنج و غم اور آنسو ہیں ۔

✓ نہ سمجھا درد ہم نے بھید یاں کی شادی و غم کا
سحر خنداں ہے کیوں ، روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

دنیا کے بارے میں درد کا خیال ہے کہ یہاں کوئی حسن نہیں ہے بلکہ یہ تو ہمارا خیال ہے کہ اس کو حسین خیال کرتے ہیں ۔

مت جا ترو تازگی پہ اس کی   عالم تو خیال کا چمن ہے

دہلی کی بربادی کی کہانی درد کی زبان سے سنو ۔

گذروں ہوں جس خرابہ پہ کہتے ہیں واں کے لوگ
ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا یہ باغ تھا

جب وہ بڑے بڑے اہلِ علم اور صاحب اقتدار لوگوں کو خاک و خون میں ملتے دیکھتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں

آہ وہ شخص جو دیتے تھے خبریں غیب کی
ڈھونڈتے پھرتے ہیں ان کو لوگ دے کیا ہو گئے

ان حالات کو دیکھ کر درد اس نتیجہ پر پہنچے کہ دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں کی ہر خوشی اور کامیابی کا انجام غم اور ناکامی ہے۔ اس لیے وہ اپنی زندگی سے تو بیزار ہوتے ہی ہیں۔ ان کو حیرت ہے کہ ان حالات میں حضرت خضر[1] کیوں کر اتنی لمبی عمر گزاریں گے۔

ہم اتنی عمر میں دنیا سے ہو گئے بیزار — عجب ہے کہ خضر نے کیوں کر کہ زندگانی کی

وہ سوچتے ہیں کہ جب ہر چیز کا انجام تباہی ہے تو تعمیر سے کیا فائدہ

منعم[2] ایسے قصر لاکھوں مل گئے ہیں خاک میں
جز خرابی کے تھا کیا فائدہ تعمیر سے

تقدیر کا تصوّر

تقدیر کے سامنے انسان کی بے بسی کا مسئلہ اکثر صوفیوں اور فلسفیوں کے سامنے رہا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں۔ آدمی اپنی قسمت خود بناتا ہے اور اپنے حالات کا خود ذمّہ دار ہے۔ جیسا کہ تم نے اقبال کی شاعری میں پڑھا ہو گا۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان اپنے عمل سے زندگی کو جنّت بھی بنا سکتا ہے اور جہنّم بھی۔ انسان کو حالات کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ حالات کو اپنا پابند بنانا چاہیے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نوری ہے نہ ناری ہے

یا وہ کہتے ہیں۔ ع اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔
مگر یہ خیالات ہمیں صرف جدید زمانے میں نظر آتے ہیں۔ جب کہ اس سائنس

[1] خضر: ایک بزرگ اور بعض کہتے ہیں کہ وہ نبی ہیں۔ ان کے متعلق روایت ہے کہ وہ قیامت تک زندہ رہیں گے۔ [2] منعم: نعمت والے۔ مالدار

کے زمانے میں لوگوں کے خیالات میں زبردست تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے۔ جب انسان کو بے حقیقت تنکا سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ وہ ہر طوفان سے مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ پرانے زمانے میں کچھ تو ان حالات کے نتیجہ کے طور پر جن کا کچھ حال تم پڑھ چکے ہو اور کچھ تصوّف کی تعلیم کے اثر سے کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں پانی کے ایک بلبلہ کی سی ہے جس کو حالات کا بہاؤ جدھر چاہے بہا کر لے جاتے اور ہوا کا جھونکا جب چاہے اس کو ختم کر دے۔ لوگوں میں یہ پختہ یقین ہو گیا تھا کہ آدمی تقدیر کا غلام ہے۔ ہماری قسمت میں جو بھی لکھ دیا گیا ہے اور جس قدر لکھ دیا گیا ہے اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ خواجہ میر درد بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے خراب سے خراب حالات میں بھی دہلی سے کہیں اور جانے کا ارادہ بھی نہ کیا اور یہیں رہ کر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرتے رہے یہی خیال ان کی شاعری میں بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہم مجبور ہیں اور جو اختیار ملا ہے وہ بھی اس لیے کہ اس کو رکھنے کے لیے ہم مجبور تھے۔

اس امر میں بھی یہ بے اختیار ہے بندہ — ملا بھی درد اگر یاں کچھ اختیار مجھے

کہیں کہیں یہ خیال اس حد تک بڑھ گیا ہے۔

نہ اٹھو درد اپنے بستر سے یاں طمع کر کے
جو کچھ یوں غیب سے آوے سو تم البتہ لو بیٹھے
نہ ہم کچھ اب طلب نے تلاش کرتے ہیں
جو کچھ کے یاں ہے مقدّر معاش کرتے ہیں

دوسرے مذہب اور عقیدہ کے ماننے والوں سے برتاؤ

صوفیوں کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں اور سب مذہبوں کی اصل ایک ہے۔ وہ پیغمبر اسلام کے اس قول پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں کہ

"خدا کے تمام بندے اس کے کنبہ میں شامل ہیں اور خدا اس کو سب

سے زیادہ پیار کرتا ہے جو اس کے بندوں کے ساتھ اچھی طرح
پیش آئے"

ہندوستان میں جتنے صوفی گذرے ہیں ان کی کوشش یہی رہی ہے کہ خدا کے بندوں کو ایک دوسرے سے قریب لائیں۔ ان میں جو ظاہری فرق اور اختلاف ہے ان کو دیکھنے کے بجائے ان کے اندر چھپی ہوئی اس سچائی کو دیکھیں جو ہر مذہب کی روح ہے۔ چنانچہ ایک مشہور بزرگ بابا فرید گنج شکر کا قصہ مشہور ہے کہ ایک بار کسی نے ان کو تحفہ میں قینچی دینا چاہی انھوں نے قینچی لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے اس کی بجائے سوئی دھاگہ دو۔ میں کاٹنا پسند نہیں کرتا میں تو کٹی ہوئی چیزوں کو سینا چاہتا ہوں۔ ہمارے یہاں جتنے بھی صوفی اور بزرگ گذرے ہیں سب کی زندگی یہی سبق سکھاتی ہے کہ اگر اللہ کی محبت حاصل کرنا ہے تو اس کے بندوں سے محبت کرو۔ بہترین عبادت بھی خدا کے بندوں سے محبت کرنا ہے۔ جس طرح خدا کی نعمتیں ہوا، روشنی اور غذا تمام انسانوں کے لیے ہے کسی ایک مذہب کے ماننے والوں کے لیے نہیں ہے۔ اس طرح بندوں کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ نیکی میں دونوں میں فرق کریں۔ سارے انسانوں کی بھلائی کا خیال کرنا چاہیے۔ حضرت محبوب الٰہی کے پیر نے ان کو نصیحت کی تھی کہ "تم ایک سایہ دار درخت کی طرح بنو۔ جس کے سایہ میں ہر ایک کو ٹھنڈک اور آرام ملے"۔ خواجہ میر درد نے بھی اپنی زندگی کا یہی انداز اختیار کیا۔ انھوں نے لوگوں کے دلوں کو ملانے کی باتیں کیں۔ ان کی نظر میں ظاہری اختلافات کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شیخ و برہمن کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے کہ دونوں کے راستے جداگانہ سہی مگر دونوں کی منزل ایک ہے۔ خدا کی محبت اور اس کی تلاش دونوں کا مسلک ہے۔

بستے ہیں تیرے سایہ میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر[1] و حرم[2] کا

[1] دیر: مندر [2] حرم: کعبہ

دوسری طرف لکھتے ہیں کہ شیخ کی اور ہماری منزل ایک ہے صرف راستوں کا فرق ہے۔

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا ہم کنشت دل میں ہو
درد منزل ایک تھی ٹک راہ کا ہی پھیر تھا

چونکہ ان کے نزدیک سب مذہبوں کی اصل ایک ہی ہے۔ اس لیے وہ ہمیں سب سے محبت کی تلقین کرتے ہیں۔ اگر واقعی سب لوگ ان کی باتوں پر عمل کرنے لگیں تو دنیا جنت بن جائے۔ درد اختلافات کو بھول کر ایک ہونے کی تعلیم دیتے ہیں۔

گر بحث کر کے بات بٹھائی تو کیا حصول
دل سے اٹھا غلاف اگر تو اٹھا سکے

وہ محبت کو سب سے بڑی عبادت خیال کرتے ہیں۔

کعبہ کو بھی نہ جائیے دیر کو بھی نہ کیجیے منہ
دل میں کسو کی در دیاں ہووے تو راہ کیجیے

جن کا دل روشن ہوتا ہے وہ کسی سے نفرت نہیں کرتے۔

جوں آئینہ منہ کسی سے مت پھیر تیرے دل میں اگر صفا ہے

کہا جاتا ہے کہ سب سے بڑا حج یہ ہے کہ لوگوں کی دلجوئی کرو۔ اس لیے کہ کعبہ سے بڑا مقام دل کا ہے۔ چونکہ دل اللہ کی گذرگاہ ہے۔ بندوں سے محبت اور ان کی دلجوئی کے لیے ہر مذہب اور مسلک میں حکم ہے۔ دیکھیے کہ درد کے یہاں تعلیم کا کیا انداز ہے۔

اکسیر[1] پر مہوس[2] اتنا نہ ناز کرنا بہتر ہے کیمیا[3] سے دل کا گداز کرنا

سونا بنانے والے تو اپنے سونا بنانے کے فن پر ناز نہ کر۔ سونا بنانے سے زیادہ بہتر ہے کہ دل کو اپنے نرم اور گداز بنا۔ دو شعر اور سنیے۔

[1] اکسیر: وہ شے جو دھات کو سونا چاندی بنا دے [2] مہوس: سونا بنانے
[3] کیمیا: سونا بنانا

یارب درست گو نہ رہوں تیرے عہد پر
بندہ سے پر نہ ہو کوئی بندہ شکستہ دل

کر زندگی اس طور سے اے درد جہاں میں
خاطر[1] پہ کسی شخص کی تو بار نہ ہووے

دنیاوی شان و شوکت سے نفرت

درد کے یہاں دنیا اور اس کی دولت اور حکومت سے جو بیزاری اور بے نیازی ملتی ہے وہ اس لیے نہیں کہ وہ خود غریب آدمی تھے۔ یہ بیزاری "انگور کھٹے" والی بیزاری نہیں ہے۔ دنیاوی شان و شوکت کو انھوں نے خود ٹھکرایا تھا اگر وہ چاہتے تو دوسرے شاعروں کی طرح دربار تک پہنچنے کی کوشش کرتے اور خاندانی سلسلہ کے باعث ان کے لیے دربار تک پہنچنا مشکل بھی نہ تھا۔ مگر کم از کم اپنی زندگی کا فائدہ اٹھا کر زندگی کے عیش و آرام پا لیتے مگر حقیقت یہ تھی کہ ان کی نظر میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ ان کو خدا کی راہ میں رکاوٹ خیال کرتے تھے۔ اس لیے نظر اٹھا کر بھی ان چیزوں کی طرف نہیں دیکھا۔ ان کے خیال میں دنیا کی محبت انسان سے اس کی سچی خوشی چھین لیتی ہے جو شخص جتنا دولت مند ہو گا اسی قدر دنیا سے رغبت بڑھتی جائے گی اور جوں جوں دنیا سے رغبت بڑھے گی وہ خدا سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ دنیا کی محبت غم میں اضافہ کرتی ہے اور خدا کی محبت خوشی دیتی ہے۔

شاہ و گدا[2] سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں — نے تاج کی ہوس نہ ارادہ کلاہ[3] کا

اگر جمعیت دل ہے تجھے منظور قانع ہو
کہ اہلِ حرص کے کب کام خاطر خواہ ہوتے ہیں

ہے محال عقل زیر آسماں — حرص ہو جس دل میں وہ خرم رہے

وہ اگر بادشاہوں میں کسی کے قائل ہیں تو حضرت ابراہیم ادہم کے جنھوں نے

[1] خاطر: طبیعت [2] گدا: فقیر [3] کلاہ: ٹوپی

اللہ کی محبت میں تخت شاہی چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی تھی۔

نہیں مذکور شاہاں درد ہرگز اپنی محفل میں
اگر کچھ ذکر آیا بھی تو ابراہیم ادہم کا

یہی نہیں بلکہ درویشی کو بہت بڑی دولت خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ درویشی بہت سی فکروں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ بادشاہ کو زندگی گزارنے کے لیے ساز و سامان اور عیش و عشرت کی ضرورت ہوتی ہے اور فقیر کسی چیز کا طلب گار نہیں ہوتا۔ مشہور ہے کہ ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے مگر ایک کمبل میں دو فقیر گزر کر سکتے۔ یہ حکایت کافی مشہور ہے کہ ایک بار سکندر بادشاہ اپنے لشکر کے ساتھ جا رہا تھا۔ راستہ میں دیکھا کہ ایک درویش ویرانے میں عبادت کر رہا ہے۔ سکندر قریب گیا مگر درویش نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ آخر سکندر نے کہا کہ میں بادشاہ ہوں کیا وجہ ہے کہ تم میری تعظیم کو نہیں اٹھے۔ اس پر درویش نے جواب دیا کہ میرے دو غلام ہیں۔ حرص اور لالچ اور تم ان دونوں کے غلام ہو۔ پھر جب تم میرے غلاموں کے غلام ہو تو پھر تعظیم کا کیسا سوال۔

ہمت رفیق ہووے تو فقر سلطنت ہے
آتا ہے ہاتھ یعنی یہ تخت دل کے ہاتھوں

بعض لوگ فقیری اور مفلسی دونوں کو ایک معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ درد کا کہنا ہے کہ فقیروں کے حال کو کبھی حقارت سے مت دیکھو۔ اس لیے کہ جس حال میں ان کو دیکھ رہے ہو وہ انھوں نے خوشی سے قبول کیا ہے۔

زنہار[1] ادھر کھولیو مت چشم حقارت
یہ فقر کی دولت ہے کچھ افلاس نہیں ہے

انسان کی بڑائی

اگرچہ درد دنیا کی ناپائداری پر یقین رکھتے ہیں اور انسان کی زندگی کو بے

[1] زنہار۔ ہرگز

حقیقت خیال کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انسان کی زندگی کو کبھی پانی کے بلبلے سے اور کبھی آگ کی چنگاری سے مثال دی ہے۔ اس لیے کہ دونوں چند لمحے کے لیے نمودار ہوتے ہیں اور پھر فنا ہو جاتے ہیں۔ مگر درد کا اسی کے ساتھ یہ خیال ہے کہ انسان کا جسم ختم ہو جاتا ہے مگر روح کی بڑائی کے قائل ہیں اور وہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس کے زندہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ذاتِ الٰہی کا حصّہ ہے اور اس کے اندر خدا کا نور ہے اور اسی باعث وہ انسان کی عظمت اور بڑائی کو مانتے ہیں۔ انسان کی بڑائی کے ترانے سن کر ایک خود اعتمادی کا احساس ہوتا ہے اور زندگی سے محبت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار

جلوہ تو ہر اک طرح کا ہر شان میں دیکھا
جو کچھ کہ سنا تجھ میں سو انسان میں دیکھا

باوجودے کہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتہ کا بھی مقدور نہ تھا

غافل تھے ہم احوالِ دلِ خستہ سے اپنے
وہ گنج[1] اسی کنج خرابہ[2] میں نہاں تھا

پہلے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یوں تو شان ہر چیز میں موجود ہے مگر اس کی حقیقی شان صرف انسان میں ہے۔ دوسرے شعر میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ آدم (انسان) کے پر اور بازو نہیں تھے کہ پرواز کر سکتا مگر اس کی بلندیٔ پرواز کا اندازہ اس سے کرو کہ انسان اس بلندی پر پہنچ گیا جہاں فرشتوں کا بھی گذر نہ تھا۔ یعنی خدا کے پاس ایک انسان (رسول اللہؐ) تو پہنچ گئے مگر فرشتہ (حضرت جبرئیل) نے کہا کہ اگر میں ایک قدم آگے بڑھاؤں گا تو میرے پر جل جائیں گے۔ تیسرے شعر کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے دل کی حقیقت سے ناواقف تھے ورنہ اس دل کے اندر وہ خزانہ (نورِ الٰہی) موجود تھا۔

---

[1] گنج: خزانہ

[2] کنج خرابہ: ویرانہ کا گوشہ

زبان و بیان

شاعری اور نثر میں بڑا فرق اندازِ بیان کا ہے ورنہ جو باتیں شعر میں کہی جاتی ہیں وہ نثر میں بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ بات کہ انسان کا اس دنیا میں آنا اور جانا دونوں اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ اس سیدھی سی بات کو جب شاعر ادا کرتا ہے تو اس میں کچھ اور ہی لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ ذوق کہتے ہیں۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بڑے شاعر معمولی بات کو بھی اس طرح ادا کرتے ہیں کہ وہ بالکل نئی اور انوکھی معلوم ہوتی ہے اور اس کا دل پر عجیب اثر ہوتا ہے۔ میر درد کے یہاں بھی ہمیں اندازِ بیان کی دل کشی کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ وہ سیدھی سادی بات کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ بے اختیار منہ سے واہ نکل جاتی ہے۔ مثلاً ایک شعر میں وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم گناہ گار ہیں اور ہمارا دامن گناہوں سے آلودہ ہے مگر پھر بھی ہمارا درجہ اتنا بڑا ہے کہ فرشتوں کو بھی رشک پیدا ہوتا ہے۔

تر دامنی[3] پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اسی طرح وہ لوگ جو گناہ گاروں کو ذلت کی نظر سے دیکھتے ہیں اپنی عبادت پر مغرور ہیں۔ ان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ انسان کے گناہ کو حقیر نہ خیال کرو۔ اگر حضرت آدمؑ جنّت میں گیہوں کھانے کا گناہ نہ کرتے تو دنیا میں نہ بھیجے جاتے اور اگر وہ دنیا میں نہ آتے تو انسانوں کا سلسلہ نہ جاری ہوتا اور تم کو عبادت کا موقع فراہم ہوتا۔ گویا تمہاری عبادت اس گناہ کی احسان مند ہے۔

مت عبادت پہ پھولیو زاہد
سب طفیل گناہ آدم ہے

محبوب پر جان قربان کر دینا محبت کا کمال ہے۔ پروانہ جو شمع پر جل کر قربان ہو جاتا ہے۔ وہ محبت کرنے والوں کے لیے نمونہ ہے۔

---

[3] تر دامنی: گناہ گاری

ایک ہی جست میں لی منزلِ مقصود اس نے
راہرو رشک کی جا ہے سفر پروانہ

غرض درد کے یہاں ایسے اشعار کثرت سے مل جائیں گے جن میں انھوں نے معمولی بات کو اپنے اندازِ بیان کی ندرت سے خوبصورت اور پراثر بنا دیا ہے۔

سادگی

اسی ندرتِ بیان کے ساتھ ان کی شاعری کی خاص خصوصیت سادگی اور صفائی ہے۔ محمد حسین آزاد کی اس بارے میں رائے بہت اہم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

"خواجہ میر درد صاحب کی غزل سات شعر یا نو شعر کی ہوتی ہے۔ بلکہ انتخاب ہوتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے۔ گویا تلواروں کی آبداریؔ نشتروں میں بھر دیتے تھے۔"

صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

جان سے ہو گئے بدن خالی — جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ، فریاد، آہ اور زاری — آپ سے ہو سکا، سو کر دیکھا
سب کے یاں تم ہوئے کرم فرما — اس طرف کو کبھی گذر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم — نہ کیا رحم تو نے، پر نہ کیا
جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
دل زمانہ کے ہاتھ سے سالم — کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے — آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
ان دنوں کچھ عجب ہے دل کا حال — دیکھتا کچھ ہے دھیان میں کچھ ہے

محاورے اور ضرب المثال

الفاظ کے ایک تو وہ معنی ہیں جو لغت میں بتائے گئے ہوں۔ لیکن جیسے

لہ آبداری۔ چمک، تیزی

جیسے زبان ترقی کرتی ہے اور اس میں خیالات کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسی لفظ کو اصل معنی سے ہٹ کر کسی اور خیال کے اظہار کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگتا ہے۔ اس کو محاورہ کہتے ہیں۔ محاورہ کا استعمال وہی لوگ کر سکتے ہیں جو زبان کے ماہر ہوں۔ کسی غیر ملکی سے بات چیت میں اگر یہ محاورے بولے جائیں گے تو وہ ان کا مطلب نہیں سمجھے گا۔ مثال کے طور پر غم کھانا، دل بھر آنا، جی جلنا وغیرہ اسی طرح کبھی شعر کا کوئی ٹکڑا یا مصرعہ خاص و عام کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے اور عام بول چال میں بے ساختہ اس کا اظہار ہو جاتا ہے مثلاً ع پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ ع جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ خواجہ میر درد کے یہاں محاوروں کا دلچسپ استعمال موجود ہے اور اسی طرح ان کے بہت سے مصرعہ ضرب المثل بن گئے ہیں۔

محاورے:—

ٹھہر جا ٹک بات کی بات اے صبا — کوئی دم میں ہم بھی ہوتے ہیں ہوا
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
وہ نگاہیں جو چار ہوتی ہیں — برچھیاں ہیں کہ دل کے پار ہوتی ہیں
شمع کی مانند ہم اس بزم میں — چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

ضرب الامثال:—

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

درد کی شاعری اور حالات کے اس مختصر سے جائزہ سے تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ان کی شاعری کیسی خوبیاں رکھتی ہے اور یہ کہ انھوں نے اردو شاعری کو ایسی خوبیوں سے مالا مال کر دیا جن کا ذکر اس وقت تک کیا جائے گا جب تک اردو شاعری کو پڑھنے والے اور اس سے دلچسپی لینے والے موجود رہیں گے۔ ان کا سیدھا سادہ اور پراثر لہجہ ان کے پاکیزہ خیالات ان کے اخلاقی اور صوفیانہ

مضامین یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہمیشہ دل کو لبھاتی رہیں گی ۔ وہ ایک اچھے انسان بھی تھے اور اچھے شاعر بھی ۔ انھوں نے جو بھی کہا دل سے محسوس کر کے کہا اس لیے ان کی بات میں اتنا اثر ہے اور اگر انھوں نے اپنی شاعری کے بارے میں دعویٰ کیا ہے تو غلط نہیں ہے ۔

یہ تیرے شعر ہیں اے دردؔ یا کہ نالے ہیں
جو اس طرح سے دلوں کو خراش کرتے ہیں

Rs. 4.50